قانونِ اسلامی ۔ اختصاصی مطالعہ ١٩

اصولِ فقہ

پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل

شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانون اسلامی۔ اختصاصی مطالعہ

اصول فقہ......۱۹

اجتہاد اور تعبیر شریعت ۔۴

پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل

پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانون اسلامی۔ اختصاصی مطالعہ

اصول فقہ۔۔۔۔۱۹

اجتہاد اور تعبیر شریعت۔ ۴

عنوان	:	پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل
مؤلف	:	پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی
نظر ثانی	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ادارت	:	ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں
حتمی تصحیح	:	ڈاکٹر شہزاد اقبال شام
نگران منشورات	:	ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین
نگران مطالعہ اسلامی قانون کورس	:	ڈاکٹر شہزاد اقبال شام
ناشر	:	شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مطبع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی
سال طباعت	:	اول: ۲۰۰۳ء دوم: جون ۲۰۰۵ء سوم: جنوری ۲۰۱۱ء
تعداد	:	۱۱۰۰ ۲۵۰۰ ۱۰۰۰

ISBN 969-8263-24-1

فہرست

۱۔	پیش لفظ	۵
۲۔	تعارف	۷
۳۔	پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل	۹
۴۔	اسلامی قوانین کا نفاذ: ضرورت و اہمیت	۱۰
۵۔	اسلامی قوانین کا نفاذ کیسے ہو؟	۱۰
۶۔	پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ	۱۳
۷۔	قرارداد مقاصد	۱۳
۸۔	بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ	۱۵
۹۔	علماء کرام کا بائیس نکاتی فارمولا	۱۶
۱۰۔	قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کا اختیار کسے ہو؟	۱۷
۱۱۔	۱۹۵۶ء کا دستور	۲۰
۱۲۔	مسلم عائلی قوانین	۲۱
۱۳۔	۱۹۶۲ء کا دستور	۲۲
۱۴۔	اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل	۲۲
۱۵۔	بدکاری کا انسداد	۲۲
۱۶۔	۱۹۷۳ء کا دستور اور اسلامی نظریاتی کونسل	۲۳
۱۷۔	قادیانی غیر مسلم اقلیت	۲۳
۱۸۔	۱۹۷۷ء کا مارشل لاء	۲۴
۱۹۔	شریعت سے متعارض قوانین کی منسوخی کا اعلیٰ عدلیہ کو اختیار	۲۴
۲۰۔	شریعت بنچوں کا قیام	۲۴
۲۱۔	عدلیہ کے اختیار سے مستثنیٰ امور	۲۵

۲۲۔ حدود آرڈیننس کا نفاذ ۲۶
۲۳۔ تعمیر مکان کے لیے قرضوں پر سود کا خاتمہ ۲۸
۲۴۔ وفاقی شرعی عدالت کا قیام ۲۸
۲۵۔ زکوٰۃ وعشر آرڈیننس ۳۰
۲۶۔ رائے عامہ کی تیاری ۳۱
۲۷۔ انصاری کمیشن ۳۲
۲۸۔ قراردادِ مقاصد آئین کا حصہ ۳۲
۲۹۔ پرائیویٹ شریعت بل اور نواں ترمیمی بل ۳۳
۳۰۔ نفاذِ شریعت آرڈیننس ۳۳
۳۱۔ قصاص و دیت کا قانون ۳۴
۳۲۔ قومی معیشت کو سود سے پاک کرنے کی کوششیں ۳۵
۳۳۔ اسلامیانے کے عمل میں رکاوٹیں ۳۷
۳۴۔ اہم نکات ۴۱
۳۴۔ کتب برائے مزید مطالعہ ۴۲

پیش لفظ

کسی ریاست کا رائج قانون اس میں بسنے والوں کے اساسی نظریات وعقائد کا عکاس ہوتا ہے۔ ورنہ قانون اور قوم میں اجنبیت کے باعث نہ تو قانون اس قوم میں قبولیت عام کی سند حاصل کرتا ہے اور نہ قوم اس کے احترام اور پاسداری میں گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ معاشرتی اشتات وانتشار اور بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر قانون اجنبی اور مسلط کردہ ہو تو اس پر عمل جبر کے تحت ہوتا ہے اور مجبور قومیں آزاد نہیں ہوتیں۔ اجنبی قانون تو وہ قومیں اپناتی ہیں جو خود کسی دستور اور نظمِ قانون سے تہی دامن ہوتی ہیں۔

مسلم امہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ دستور سازی اور قانون سازی پر اس کا علمی ورثہ بہت گراں قدر ہے۔ گذشتہ ۱۳ صدیوں سے مسلمان اہل علم کی تحریریں قانون اور اصول قانون پر دنیا بھر کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ)، امام محمد شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) اور امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کی کتابیں آج بھی روشنی کا منبع ہیں۔

امت مسلمہ کے قانونی اور دستوری نظام کے دو بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر اسلام کا قانونی نظام نہ تو اپنی صحیح شکل وصورت میں قائم رہتا ہے اور نہ ان سے فکری غذا حاصل کیے بغیر ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ پہلا بنیادی عنصر اسلامی عقائد ہیں جن کی وجہ سے اہل ایمان میں فکری استحکام پیدا ہوتا ہے۔ یہ فکری استحکام ایمان ویقین کی وجہ سے اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ صاحب ایمان کو ہر قسم کی فکری بے راہ روی سے محفوظ کر کے حق وصداقت کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ دوسرا بنیادی عنصر اخلاق وتزکیہ ہے۔ مکارم اخلاق کی تعلیم اور تزکیہ نفس انسان کے کردار، مزاج اور رویہ کی اصلاح کر کے اسے معاشرہ میں تہذیب وشائستگی کے اعلیٰ مقام پر فائز رکھتے ہیں۔

امت مسلمہ جب تک اپنے فقہی اور قانونی ورثہ سے وابستہ رہی اس وقت تک اس کی ترقی کی رفتار بھی تیز رہی اور عالمی قیادت میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے بہترین نمونہ بھی پیش کرتی رہی۔

لیکن جب مسلمانوں میں بنیادی عقائد کی تعلیم وتربیت کا نظام کمزور پڑ گیا اور اخلاقی اقدار میں ضعف پیدا ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور قانونی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ پھر استعماری دور میں اسلامی روایات، نظام تعلیم، قانون اور تہذیب کو مٹانے کے لیے منظم کوشش کی گئیں جس کے نتیجے میں برصغیر میں اسلامی عدالتی اور تعلیمی نظام کی جگہ استعمار کے اپنے نظام نے لے لی۔ اس صورت حال نے اس پورے خطہ کو بری طرح متاثر کیا اور بتدریج ہر شعبہ زندگی میں شر وفساد سرایت کرتا چلا گیا جس کے تباہ کن اثرات سے آج ہم دوچار ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے برحق فرمایا تھا:

نَحْنُ قَوْمٌ، اَعَزَّنَا اللّٰهُ، بِالْاِسْلَامِ، وَاِنِ ابْتَغَيْنَا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهِ اَذَلَّنَا اللّٰهُ

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی
اگر ہم نے عزت کو اسلام کے علاوہ کسی اور نظام حیات میں تلاش کیا تو
اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔

لیکن آج مسلمانوں میں موجودہ صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے تڑپ پائی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ غیر اقوام کے قانون سے خود کو آزاد کرا کے قرآن وسنت کے نظام حیات میں دوبارہ عزت تلاش کریں۔ اسی تڑپ کے وہ مظاہر ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں عالم اسلام اور عالم کفر کے مابین کشمکش کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

امت مسلمہ کو ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جن کی جدید قانونی نظریات پر تنقیدی نظر ہو اور جو فقہ اسلامی کے اصل مآخذ سے استفادہ کرنے پر دسترس رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا احکام شریعت کی اکملیت، حقانیت اور ان کے قابل عمل ہونے پر غیر متزلزل ایمان اور ان احکام کو روبہ عمل دیکھنے کی حقیقی تمنا اور لگن بھی ہو۔

ایسے رجال کار کی تیاری میں شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اپنے قیام کے روز اول سے مصروف عمل ہے۔ اس کام میں بیرون ملک کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی قانون دان طبقوں کے تربیتی پروگراموں کا انعقاد مسلسل جاری ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف وتالیف کے شعبہ میں فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ''سلسلہ مباحث فقہیہ'' کی تیاری اور اردو اور انگریزی زبانوں میں تراجم کا کام بھی ہو رہا ہے۔ شریعہ اکیڈمی کے تحت ''مطالعہ اسلامی قانون'' پر ایک ابتدائی کورس کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس ایک سالہ فاصلاتی کورس کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک ہزاروں افراد اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکے اور کر رہے ہیں۔

ہم نے اس ابتدائی کورس کے آغاز پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ''ایڈوانس کورسز'' تیار کیے جا رہے ہیں اور جلد ہی ان کو شروع کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالی کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمارے عزم کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولی بخشا' ہماری راہیں آسان فرمائیں اور ہم اس قابل ہوئے کہ اصول فقہ (ISLAMIC JURISPRUDENCE) میں اختصاصی مطالعہ (ADVANCE COURSE) کا اجراء کر سکیں۔ فاصلاتی نظام کے تحت یہ اختصاصی مطالعہ چوبیس درسی اکائیوں (Units) پر مشتمل اور ایک سالہ دورانیہ کا ہے۔

اسلامی قانون میں دیگر اختصاصی مطالعہ جات کی تیاری کا کام جاری ہے۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اس نے جس طرح ہمیں اصول فقہ میں اس اختصاصی مطالعہ کو شروع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اسی طرح ہمارے دیگر منصوبوں کی تکمیل میں فضل الٰہی شامل حال رہے گا۔ ان شاء اللہ

پاکستان بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر قانون الٰہی کے غلبہ وقیادت کے لیے مطلوبہ رجال کار کی تیاری کسی ایک ادارے کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں امت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق کردار ادا کرنا ہے۔

ہم اہل علم سے ایسی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے منصوبوں کی بہتری میں ممد ومعاون ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
اسلام آباد

تعارف

اپنے مقصد وجود کی تکمیل کے لیے پاکستان میں رائج قوانین کو اسلامیانے اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوششیں پاکستان کے قیام ہی سے جاری ہیں جو سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر کی جاتی رہی ہیں۔ قوانین کو اسلامیانے اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا عمل دراصل اس ہمہ گیر تبدیلی کا اہم حصہ ہے جسے اقامت دین یا اسلامی نظام کا قیام کہتے ہیں۔

زیر نظر درسی اکائی (Unit) اس عظیم مقصد کے اسی اہم حصے سے متعلق ہے جس میں قوانین کو اسلامیانے اور ان کے نفاذ میں کیے گئے اقدامات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کام میں سرکاری اداروں کی کارکردگی، اس راہ میں درپیش مشکلات، اس کی سست روی کے اسباب اور یک عملی نظام قانون نہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ واضح ہوگا کہ اقامت دین اور قیام پاکستان کے مقاصد حاصل کرنے کے سلسلے میں اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمیں مزید کیا کچھ کرنا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کا عمل

پاکستان غالباً جدید دنیا کا وہ واحد اسلامی ملک ہے جو اس عہد و پیمان کے ساتھ وجود میں آیا تھا کہ یہاں اسلامی نظریات کو عملی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ اور تحریک پاکستان کے صف اوّل کے قائدین نے بار بار اس بات کو دہرایا تھا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا جس کے بموجب قانون سازی کے دوران قرآن و سنت کی تعلیمات سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا اور اسلامی شریعت سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اس ملک کی پالیسی وضع کی جائے گی۔ قائداعظمؒ نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا تھا اور اسے ایک ایسی تجربہ گاہ قرار دیا تھا جس میں دنیا پر عملاً یہ ثابت کر کے دکھانا تھا کہ اسلامی اصول آج بھی اتنے ہی قابل عمل ہیں جتنے تیرہ سو سال قبل تھے۔ تحریکِ پاکستان کے تمام ذمہ دار رہنماؤں نے جن میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور مسلم لیگ کی صدارت میں قائداعظمؒ کے جانشین بھی شامل تھے، قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں اس عہد کو بار بار دہرایا تھا۔

ہندوستان کی تقسیم کا عمل برطانوی پارلیمنٹ سے منظور شدہ ایکٹ ''قانون آزادی ہند مجریہ ۱۹۴۷ء'' کے تحت مکمل ہوا تھا۔ اس ایکٹ میں یہ درج تھا کہ پاکستان اور بھارت کی قانون ساز اسمبلیاں جب تک اپنے اپنے ملکوں کے لیے مستقل آئین وضع نہیں کر لیتیں وہ ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، مجریہ ۱۹۳۵ء'' کے تحت ملکی معاملات چلاتی رہیں گی۔ لہٰذا قیام پاکستان کے موقع پر اس ایکٹ میں چند ضروری اور جزوی تبدیلیاں کر کے اسے مملکت خداداد پاکستان کا عارضی دستور قرار دے دیا گیا۔

یہاں یہ بات لائق ذکر ہے کہ اپنے قیام کے روز اوّل سے چھ ماہ بعد تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوا۔ اگرچہ نوزائیدہ مملکت کے ابتدائی مسائل میں مہاجرین کی آبادکاری، وسائل کی کمیابی اور انتظامی مشینری کی قلت جیسے اہم امور شامل تھے لیکن اس بات کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اپنا علیحدہ ملک حاصل کرنے کے آٹھ نو سال بعد تک اپنا دستور نہیں بنا سکے تھے۔ اس دوران میں آزاد مملکت پاکستان کا حکومتی انتظام و انصرام برطانوی پارلیمنٹ سے پاس شدہ ''انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء'' کے تحت ہی چلتا رہا۔

عدالتی امور بھی انگریزوں کے چھوڑے ہوئے قوانین کے تحت چلائے جاتے رہے مثلاً تعزیرات پاکستان ۱۸۶۰ء، ضابطہ فوجداری ۱۸۹۸ء، ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء اور پولیس ایکٹ ۱۸۶۸ء وغیرہ۔ تمام قوانین جو انگریزی استعمار کے دور میں نافذ کیے گئے تھے، جوں کے توں جاری رہے اور سالہا سال تک ان میں کسی تبدیلی کا تو کیا ذکر، ان میں ضروری رد و بدل پر بھی کسی نے سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ آزاد ملک کے آزاد شہریوں کے لیے پولیس ایکٹ بھی من و عن وہی نافذ کر دیا گیا اور آج تک نافذ ہے جو انگریز حکمرانوں نے اپنے غلاموں کو کنٹرول کرنے کے لیے بنایا تھا۔

اسلامی قوانین کا نفاذ، ضرورت و اہمیت

اسلامی قوانین کا نفاذ اس ہمہ گیر اور بھرپور تبدیلی کا ایک اہم حصہ ہے جسے ہم اقامت دین، نفاذ شریعت یا نظام اسلام کا قیام کہتے ہیں۔ اس پورے عمل میں سب سے اہم اور بنیادی کام اسلامی معاشرے میں مختلف میدانوں کے لیے افراد کا تیار کرنا ہے۔ اس طویل عمل میں ایک ایسے نظام معیشت کا قیام بھی شامل ہے جو اسلام کے عدل اجتماعی کے تصور کے مطابق کاروبار اور لین دین کے نظام کو از سر نو منظم اور مرتب کرتا ہو۔ اس میں افراد کے آپس میں تعلقات کی وہ نہج بھی شامل ہے جو قرآن و سنت نے متعین کی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اس عمل کا ایک لازمی حصہ ایک ایسی حکومت کے ڈھانچے کی تشکیل بھی ہے جو ایک اسلامی ریاست کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے جس کا کام معروفات کو قائم کرنا اور منکرات کو ختم کرنا ہے۔ یہ ایک بھرپور اور ہمہ گیر عمل ہے جس کا ایک جزو اسلامی قوانین کا نفاذ بھی ہے۔

لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ اس حقیقت کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قانون از خود کوئی معاشرتی اصلاح نہیں کر سکتا بلکہ جب معاشرتی اصلاح کا عمل مکمل ہو جائے یا ایک خاص سطح تک پہنچ جائے تو اس اصلاح کے تحفظ اور اس کے خلاف کارفرما قوتوں کا راستہ روکنے کے لیے قانون کا وجود ضروری ہے۔ جب تک کوئی اسلامی معاشرہ موجود نہ ہو جہاں خاندان اسلام کے نظام و تعلیم کے مطابق استوار نہ ہوں اور جہاں معاشرت، لین دین، اخلاق و کردار، طرز عمل اور افراد کے درمیان ہر قسم کے معاملات شریعت کے تابع نہ ہوں، اس وقت تک قانون کے ذریعے کسی ایسے معاشرے کو قائم نہیں کیا جا سکتا جو وہاں پہلے سے موجود نہ ہو۔ اس سلسلہ میں نبوی نمونہ عمل ہمارے سامنے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تیرہ سال تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی، افراد اور خاندانوں کو تیار کیا اور ایک ایسی امت مسلمہ تشکیل فرمائی جس کے تحفظ اور فروغ کے لیے اور اسلام کے عمومی مقاصد و اہداف کی تکمیل کے لیے ریاست کی ضرورت پیش آئی۔ پھر ریاست کی بقاء اور تحفظ کے لیے قوانین ناگزیر ہوئے۔ یوں قوانین کے نفاذ کا مرحلہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ نفاذ قانون سے پہلے ریاست کی ضرورت ہے، ریاست سے پہلے معاشرے کی، معاشرے سے پہلے خاندان کی اور خاندان سے پہلے افراد کی ضرورت ہے اور ان سب چیزوں کو منضبط اور منظم کرنے کے لیے ایک ایسی ہمہ گیر تحریک کی ضرورت ہے، جس کے نتیجہ میں یہ سارے کام ایک ترتیب سے ہوتے چلے جائیں۔

اسلامی قوانین کا نفاذ کیسے ہو

بیسویں صدی کے وسط میں جب دنیا کے مختلف ممالک میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس دور میں اسلامی ریاست کا احیاء کیسے کیا جائے اور جدید جمہوری ماحول میں اسلامی شریعت کی بالادستی کیسے قائم کی جائے تو بہت سے حضرات کے ذہنوں میں اسلامی ریاست کا کوئی واضح نقشہ اور تصور نہیں تھا۔ آج یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے اور یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اہل علم و دانش کے ذہنوں میں یہ تصور واضح کیوں نہیں تھا۔ اس تصور کے واضح نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاستیں کم و بیش دو سو سال پہلے مغربی استعمار کی آمد پر ایک ایک کر کے ختم کر دی گئی تھیں۔ اسلامی قوانین کو ایک ایک کر کے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی ادارے ایک ایک کر کے مٹا دیے گئے تھے۔ اب بیسویں صدی کا وسط آتے آتے صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ مسلمان کئی سو سال سے جس نظام اور جن اداروں سے مانوس تھے وہ اسلام سے بالکل متعارض تھے، اس لیے ان کے سامنے ایسا کوئی عملی نقشہ برسر زمین موجود اور کارفرما نہیں تھا جس کی بنیاد پر اور جس کو سامنے رکھ کر وہ ایک نئے نظام کا خاکہ مرتب کر سکتے۔

اسلامی ریاست وحکومت کے موضوع پر قدیم دینی لٹریچر اور اسلامی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ملتا ہے وہ تین قسم کی چیزوں سے عبارت ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی سیاسی نظام کے بارے میں علامہ ماوردیؒ (م ۴۵۰ھ) کی مشہور کتاب ''الاحکام السلطانیة'' جو پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھی گئی تھی اور اسی طرح کی دیگر بہت سی کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تین اقسام کے معاملات سے بحث کی گئی ہے:

کچھ معاملات بنیادی احکام سے متعلق ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جو قرآن وسنت کی نصوص میں بیان ہوئے ہیں اور جن کو اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرہ کا اساسی عنصر اور شرط لازم یا جزولاینفک قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی ایک ایسالازمی عنصر جس کی عدم موجودگی میں نہ معاشرے کو اسلامی معاشرہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ریاست کو اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا حصہ ان احکام پر مشتمل ہے جو فقہائے اسلام نے اپنے اجتہاد اور فہم وبصیرت کی روشنی میں مرتب کیے ہیں جن سے اختلاف کرنے کی گنجائش بعد کے مفکرین اور مجتہدین کے لیے موجود ہے اور موجود رہی ہے، بلکہ ان احکام کے زمرہ سے تعلق رکھنے والے بعض معاملات میں قدیم فقہاء سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ ان امور پر مشتمل ہے جو فقہائے کرام کے کسی اجتہاد پر مبنی نہیں تھا بلکہ وہ ان فیصلوں اور احکام پر مشتمل ہے جو مختلف انتظامی اداروں کے لیے مرتب کئے گئے تھے اور جن کو مختلف مسلمان حکمرانوں اور مسلمان ریاستوں نے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اختیار کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف مسلمان حکمرانوں اور مسلمان ریاستوں نے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر مختلف زمانوں میں مختلف ادارے قائم کیے اور ان اداروں کے لیے تفصیلی احکام بھی مرتب کرائے۔ ریاستی مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مختلف اداروں کے قیام کی ضرورت ہر دور میں پیش آتی ہے اور اس دور میں بھی پیش آتی تھی۔ بعض ادارے پہلی صدی ہجری میں وجود میں آئے، بعض دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی میں بنائے گئے۔ غرض ہر صدی میں بعض اداروں کے قیام کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی۔ ان اداروں کے بارے میں بھی تفصیلات ان کتابوں میں موجود ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج ہمارے دور میں اسلامی ریاست قائم کی جائے گی تو کیا اس کے لیے متذکرہ بالا تینوں قسموں کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہوگا؟ دور جدید میں اسلامی ریاست کی بات کرنے سے قبل اس اہم سوال پر غور کرنا اور اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ قرآن پاک، سنت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور فقہاء کی تصریحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں قسم کے احکام کی حیثیتیں مختلف ہیں۔ پہلی قسم کے احکام جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں منصوص ہیں وہ اپنی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ جن میں کوئی نظر ثانی یا سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہوسکتی، لازمی طور پر واجب التعمیل ہیں۔

جو معاملات اجتہادی ہیں ان میں اس دور کے مفکرین اور مجتہدین کو کم از کم نظری اعتبار سے اس بات کا اختیار ہے کہ وہ موجودہ دور کے لحاظ سے ان میں کسی تبدیلی یا اجتہاد کی ضرورت محسوس کریں تو شریعت کی دی ہوئی گنجائش کے مطابق نئے احکام وضع کر سکتے ہیں۔

تیسری قسم کے احکام کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ کیا وہ اس دور میں بھی اپنی معنویت رکھتے ہیں؟ اور کیا وہ یا ان میں سے چند احکام موجودہ حالات کے سیاق وسباق میں قابل عمل ہیں؟ مثال کے طور پر جہاد کا حکم تو شریعت میں ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، لیکن جہاد کے لیے ادارے، تنظیمیں اور حالات کے موافق طریق کار ہر دور میں متعین کیے جاتے رہے ہیں۔ تاہم ان تنظیمات اور

اداروں کی تفصیلات وضع کرنے میں حالات و زمانہ کی رعایت رکھی جائے گی۔ان تفصیلات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اگر ان سے بہتر کوئی تدبیر اور تنظیم موجود ہے تو اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

بہت سے مسلمان دانشور ان تینوں اقسام کے احکام میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور اس عدم امتیاز کی بناء پر فکری الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات انہی الجھنوں کی بناء پر خود شریعت ہی سے بدظن ہو جاتے ہیں اور اسلام کے بارہ میں ان کے ذہنوں میں الجھنیں اور شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔وہ اس تیسری قسم کے احکام کو بار بار دہرا کر یہ کہتے ہیں کہ اس دور میں یہ احکام کیسے چل سکتے ہیں؟ اس دور میں تلوار سے جہاد کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اور آخر قتل کے کسی مجرم کو سزا دینے کے لیے تلوار ہی سے گردن اڑانے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسری طرف کچھ لوگ جو شریعت کے علمبردار ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان تینوں اقسام کے احکام کو تمام تفصیلات کے ساتھ جوں کا توں اس دور میں بھی اختیار کیا جانا ضروری ہے۔ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے حامل حضرات نے کبھی سنجیدگی سے شریعت کے احکام اور مسلمانوں کے تاریخی تجربہ کے مابین فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔اس کا نتیجہ مزید ژولیدگی کی صورت میں نکلا اور یوں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوتی گئی جس نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سارے معاملہ کو خاصا پیچیدہ بنا دیا۔حکومت پاکستان نے ۱۹۴۸ء میں اسلامی نظام کا خاکہ مرتب کرنے کے لیے تجاویز طلب کیں۔بہت سے لوگوں نے اس سلسلے میں اپنی تجاویز دیں۔ان میں سے دو کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جس سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی نظام کے بارے میں لوگوں میں کس انداز کی فکر پائی جاتی رہی ہے اور وہ نفاذ شریعت کے معاملے کو کس طرح دیکھتے رہے ہیں۔ایک خاکہ میں تجویز کیا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کا نظام نافذ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فلاں خاص فقہ سے وابستہ جتنی مساجد ہیں ان سب کا سروے کر کے ان سب کی ایک فہرست مرتب کر لی جائے۔اس فہرست کے مرتب کرنے کے بعد ان مساجد کے خطباء اور ائمہ مساجد اور ان مساجد میں قائم مذہبی مدارس کے سربراہان کو دعوت دی جائے کہ وہ اپنے میں سے سب سے زیادہ متقی اور صاحب علم شخصیت کو منتخب کر لیں اور جب وہ شخصیت منتخب ہو جائے تو سب ائمہ اور خطباء حضرات اس شخصیت سے بطور امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین بیعت کر لیں۔بیعت کے بعد پاکستان کا نظام اس شخصیت کے سپرد کر دیا جائے اور پھر سارا کام اسی کے ہاتھوں چلے۔وہ شخصیت جو بھی نظام حکومت چلائے گی وہی اسلامی نظام حکومت ہوگا۔ اور اس کی ہدایات اور احکام کے نفاذ کو شریعت کا نفاذ قرار دیا جائے گا۔ظاہر بات ہے کہ نفاذ شریعت کی یہ شکل نہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں ممکن تھی، نہ آج ممکن ہے اور نہ آئندہ ممکن ہوگی اور نہ نفاذ شریعت کے یہ معنی ہیں کہ کسی خاص مسلک یا طبقہ کے آئمہ مساجد اور خطباء کو بلا کر معاملات ریاست ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔

ایک اور خاکہ کی رو سے حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ فلاں مسلک کے ایک بڑے ممتاز اور جید عالم کو شیخ الاسلام کے منصب پر فائز کر دیا جائے وہ شیخ الاسلام مساجد کا نظام چلائے، نکاح اور طلاق کے مقدمات کی سماعت کرے۔جب ایسا ہو جائے گا تو پاکستان میں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو جائے گا۔

اگر اسلامی نظام کے قیام کا مطلب یہی ہے کہ ایک مشہور عالم شیخ الاسلام کہلاتے ہوں، وہ مساجد کا نظام چلاتے ہوں اور نکاح و طلاق کے مقدمات جو ان کے پاس آئیں ان کا فیصلہ کرتے ہوں تو اس اعتبار سے آج کا روس بھی اسلامی مملکت ہے، کیونکہ وہاں شیخ الاسلام کا منصب بھی موجود ہے، وہاں مسجدوں کا نظام بھی شیخ الاسلام کے سپرد ہے اور جو لوگ نکاح و طلاق کے مقدمے شیخ الاسلام کے پاس لے کر آتے ہیں وہ ان

کا فیصلہ بھی کر دیتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے کئی ممالک آج اسلامی ممالک کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس بات سے نہ کوئی صاحب علم و بصیرت اتفاق کرے گا اور نہ اسلامی نظام کے یہ معنی ہیں۔

ان دو مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعض حضرات کے ذہنوں میں پاکستان کے ابتدائی دنوں میں اسلامی نظام کے بارے میں کیا تصورات تھے۔

پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ

پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ قیام پاکستان کے روز اوّل ہی سے کسی نہ کسی حد تک جاری رہا۔ بعض حضرات یہ بات بلکہ الزام کثرت سے دہراتے رہتے ہیں کہ پاکستان نے اسلامی قوانین کے نفاذ میں کوئی پیش قدمی نہیں کی اور ہمارا نامۂ اعمال اس معاملہ میں صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ تاثر درست نہیں ہے۔ ہم نے الحمدللہ بہت پیش قدمی کی ہے اور اس معاملہ میں پاکستان کا ریکارڈ دنیا کے بیشتر مسلم ممالک سے زیادہ خوش آئندہ ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطلوبہ کام پورا ہو گیا ہے تو اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ جتنا کام ہوا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جتنا کام ابھی کیا جانا باقی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔

۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۶۰ء کے بیس سالوں کے درمیان دنیائے اسلام کے کئی ممالک آزاد ہوئے۔ انڈونیشیا ۱۹۴۵ء میں آزاد ہوا، شام اور عراق کو ۱۹۴۶ء میں برطانیہ سے آزادی ملی۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ ان سب ممالک میں مصر، انڈونیشیا، شام، عراق، پاکستان اور سوڈان کے حالات تقریباً ایک جیسے رہے ہیں۔ ان سب ممالک میں عوام کی طرف سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ وہاں اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں۔ اسلامی احکام کے مطابق نظام ریاست قائم کیا جائے اور شریعت کے نفاذ کے اس عمل کو شروع کیا جائے جو مسلم اقوام کی اور ہر مسلمان کے دل کی آرزو ہے۔

پاکستان کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اسے بعض ایسے جید اور صاحب بصیرت مدبّرین کی فکری اور سیاسی رہنمائی حاصل تھی جن کی وجہ سے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا عمل صحیح خطوط پر شروع کیا جا سکا اور ایک ایسی مضبوط بنیاد بن گئی جس کو آنے والا کوئی حکمران کبھی ختم نہ کر سکا۔ اس بنیاد کو کمزور کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں اور اس کو بدلنے کی کوششیں بھی ہوئیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ بنیاد اتنے مضبوط، اتنے معقول اور اتنے منطقی خطوط پر قائم تھی کہ اس کو مٹایا نہیں جا سکا۔

قرارداد مقاصد

پاکستان کے جید اصحاب علم نے جن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی، سردار عبدالرب نشترؒ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ڈاکٹر عمر حیات ملکؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا راغب احسن، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ شامل تھے، یہ طے کیا کہ اسلامی نظام کی سمت میں پیش قدمی کا سب سے اوّلین اور ابتدائی قدم یہ ہونا چاہیے کہ پاکستان میں ایسے دستور کی تشکیل و تدوین کی جائے جس میں اسلام کے بنیادی تصورات اور احکام کو سمو دیا گیا ہو اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی دستوری ضمانت دی گئی ہو۔ ریاست کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہو کہ وہ ان معروفات کو قائم کرے جن کو قائم کرنے اور ان منکرات کو ختم کرے جن کو

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا
ختم کرنے کا قرآن وسنت میں حکم دیا گیا ہے۔ یہ مطالبہ ایک دستاویز کی شکل میں مرتب کیا گیا
کہ وہ اسے آئینی زبان میں حکومت پاکستان اور ریاست پاکستان کے ایک اجتماعی نصب العین کے طور پر اختیار کر لے۔ چنانچہ پاکستان
کو دستور ساز اسمبلی نے (جو تحریک پاکستان کے صف اوّل کے قائدین پر مشتمل تھی اور جس کو پاکستان کی نامور مذہبی قیادت کا تعاون اور رہنمائی
حاصل تھی) ان سب حضرات کے مشورہ سے جو پہلا کام اپنے ذمہ لیا وہ ایک اہم قرارداد کی تدوین اور اس کو منظور کرنے کا تھا جسے تاریخ پاکستان میں
قرارداد مقاصد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو منظور ہونے والی یہ قرارداد آج تک ایک متفق علیہ قانونی اور دستوری دستاویز کے طور پر پاکستان کے ہر دستور
میں شامل رہی ہے۔ پاکستان میں ہر طرح کی حکومت آئی، سیکولرازم کی علمبردار حکومتیں بھی آئیں، اسلام کا نام لینے والی حکومتیں بھی آئیں،
جمہوریت کے نعرے لگانے والوں نے بھی حکومت کی اور ڈکٹیٹرشپ کو سراہنے والے بھی آئے لیکن یہ قرارداد پاکستان کے ہر آئین کا حصہ رہی۔
اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرارداد مقاصد میں شامل بنیادی تصورات پر پاکستان میں ہمیشہ اتفاق رائے پایا جاتا رہا ہے۔ افسوس ہے اس
طرح کی کوئی جامع اور متفق علیہ دستاویز مسلم دنیا کے کسی اور ملک کے دستور میں شامل نہیں ہے۔ اسی لیے بہت سے مسلم ممالک میں نفاذ اسلام کے
بارے میں پاکستان جیسا کوئی آئینی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔

اس قرارداد میں مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار، بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی پہلی بار، اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ دور جدید کے تمام جمہوری
تصورات کو اسلام کے دستوری احکام سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا جائے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اسلامی تعلیم کے فلاں پہلو کی خلاف ورزی کی گئی ہے
اور جمہوری تصورات کا بڑے سے بڑا علمبردار بھی یہ نہ کہہ سکے کہ اس میں جمہوریت کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ یہ قرارداد اسلامی
دستوری اصولوں اور جدید نمائندہ حکومت کی ضرورتوں کے درمیان ایک مثالی، متوازن اور ہم آہنگ سلسلہ استدلال پیش کرتی ہے۔

اس قرارداد میں سب سے پہلے دستوری زبان میں اس حقیقت کا اعلان واعتراف کیا گیا کہ پوری کائنات پر حاکمیت اعلیٰ
(SOVEREIGNITY)' صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ عوام کے ذریعے مملکت پاکستان کو جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کی مقرر
کردہ حدود کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے گا۔ اس میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ جو لوگ حکومت میں آئیں گے وہ عوام کے معتمد علیہ اور چنیدہ نمائندے
ہوں گے۔ یہاں چنیدہ (CHOSEN) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس میں منتخب لوگ بھی شامل ہیں اور ایسے غیر منتخب شدہ لوگ بھی ہیں جو کسی رسمی
الیکشن کے ذریعے تو نہ آئے ہوں لیکن عامۃ الناس کے بہترین لوگ سمجھے جاتے ہوں اور مسلمانوں میں اعلیٰ ترین اخلاقی اور دینی معیار کے حامل
ہوں۔ قرارداد میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ مملکت خداداد پاکستان میں اسلام کے بتائے گئے جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی
انصاف کے اصولوں کی پوری طرح پابندی کی جائے گی۔ قرارداد مقاصد نے اسلامی معاشرے کے بعض شعبوں میں پائی جانے والی ان بہت سی
غلط فہمیوں کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا جن کا تعلق ایک جدید، ترقی پسند اور مستقبل پر نظر رکھنے والے معاشرے میں ریاست کے اسلامی
تصور کے نشوونما پانے کی صلاحیت سے تھا۔ اس نے ایک ایسی مشترک بنیاد فراہم کی جس سے عامۃ الناس کے دونوں دھاروں کے لیے یہ ممکن
ہو گیا کہ دو سو سال تک ایک نوآبادیاتی ملک میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہوئے روایتی مسلم علماء اور جدید مغربی ذہن رکھنے والے
دانشور ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔

جب ہم پاکستان کی آئینی تاریخ کا موازنہ بعض دوسرے مسلم ممالک کے سیاسی ارتقاء سے کرتے ہیں تو قرارداد مقاصد کی اہمیت اور زیادہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرارداد اسلام کے دستوری نظریات کو واضح اور منضبط شکل میں پیش کر کے پاکستان میں اسلامی دستوری فکر کو ایک نمایاں جہت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو ایک واضح شکل بھی دیتی ہے۔ پاکستان میں آئین سازی کی طویل تاریخ میں نہ صرف آئین سازوں نے بلکہ اعلیٰ عدالتوں نے بھی اسے ملک میں نہایت اہم عدالتی دستاویز کے طور پر لیا ہے۔ ہماری بعض اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں میں قرارداد مقاصد کو ملک میں دستور سازی کے لیے ایک مثالی نمونہ اور نقطۂ آغاز قرار دیا گیا ہے۔

تاہم اپنی اس تمام تر اہمیت کے باوجود اس قرارداد نے صرف ایسے بنیادی تصورات مہیا کیے جن کی روشنی میں مزید تفصیلات کا تعین جدید دنیا کی عملی حقیقتوں، تاریخی روایات اور مسلمانوں خصوصاً برصغیر کی مسلم تاریخ کے تجربات اور یہاں کی اجتماعی اقدار کو سامنے رکھ کر کیا جانا تھا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دو اہم کوششیں کی گئیں، ایک غیر سرکاری سطح پر اور دوسری سرکاری سطح پر۔

بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ

سرکاری سطح پر کی گئی کوشش ''بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ'' کی شکل میں سامنے آئی۔ یہ بورڈ پاکستان کی مجلس آئین ساز کے تحت وجود میں آیا جس کا کام اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آئین سازی کے معاملات میں مشاورت اور معاونت تھا۔ حکومت پاکستان کی دعوت پر مشہور مسلم دانشور اور مفکر علامہ سید سلیمان ندویؒ پاکستان تشریف لائے اور اس بورڈ کی سربراہی اختیار کی۔ دیگر ممبران میں ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، مفتی جعفر حسینؒ، مفتی محمد شفیعؒ، پروفیسر عبد الخالقؒ اور مولانا محمد ظفر احمد انصاریؒ جیسے بلند پایہ اور نامور ترین اہل علم شامل تھے۔

حکومت نے بنیادی اصولوں کی ایک کمیٹی بھی بنائی جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ دستور کا ایک مسودہ تیار کرے اور بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کی سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے دستوری خاکہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال دے۔ دستور کا یہ مسودہ اسمبلی کو پیش کیا جانا تھا۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب کمیٹی کی جانب سے دستوری مسودہ کی رپورٹ منظر عام پر آئی تو اس پر ہر طرف سے تنقید ہوئی۔ علماء کرام نے اس رپورٹ پر سخت تنقید کی کیونکہ اس میں بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کی بہت سی تجاویز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

اس کی اکثر سفارشات اسلامی تعلیمات، جمہوری تقاضوں اور قرارداد مقاصد کے خلاف تھیں۔ بلکہ یہ رپورٹ ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء'' سے ملتی جلتی تھی۔

اس رپورٹ پر علماء کرام نے بھی تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس رپورٹ میں حکومت پر آئینی طور پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے جس کی رو سے قرآن کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرنا اور منکرات کو مٹانا اس کا فرض قرار پائے۔ رپورٹ میں صرف اس بات کو کافی سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے لیے قرآن کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔

دستور ساز اسمبلی نے ان تنقیدوں کا نوٹس لیا اور نہ صرف رپورٹ پر بحث ملتوی کر دی بلکہ اس سلسلہ میں عوام سے تجاویز بھی طلب کیں۔

علماء کرام کا بائیس نکاتی فارمولا

جدید اسلامی تاریخ میں اسلامی آئین سازی کے باب میں غالباً سب سے اہم پیش رفت وہ تھی جو غیر سرکاری سطح پر کی جانے والی کوشش کے ذریعے ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک جدید اسلامی ملک میں اسلامی آئین کی تدوین کے لیے ایک ۲۲ نکاتی فارمولا اپنایا گیا۔ یہ فارمولا ملک کے ان ۳۳ دینی دانشوروں اور مشہور علماء نے مل کر تیار کیا تھا جو مختلف مذہبی اور فقہی پس منظر کے حامل تھے۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی جب مختلف دینی روایات اور مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علمائے دین اور فقہاء سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک اہم فقہی اور قانونی مسئلے پر اتفاق رائے سے ایک جامع اور قابل عمل دستاویز تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں تو ملتی تھیں کہ مختلف قانونی معاملات میں ایسے فقہاء اور علمائے دین نے اجتماعی فیصلہ دیا جن کا تعلق ایک مشترک روایت، مکتب فکر یا طرز عمل سے تھا۔ لیکن ایک ایسے قانونی فیصلے کی اولین مثال غالباً یہ بائیس نکاتی فارمولا تھا جسے مختلف مذہبی فرقوں اور مختلف فقہی مکاتب فکر کے شارحین نے متفقہ طور پر جاری کیا تھا۔ ان میں سنی اور شیعہ دانشور، حنفی اور شافعی فقہاء اور مقلد اور غیر مقلد مذہبی علماء سب شامل تھے۔ ان حضرات نے ۲۲ نکات پر مشتمل ایک ایسا مسودہ تیار کیا جس کے بارے میں ان حضرات نے اپنے انتہائی علم و بصیرت کے مطابق یہ قرار دیا کہ اگر یہ ۲۲ نکات کسی دستور میں سمو دیے جائیں تو وہ دستور اسلامی دستور کہلائے گا، اور اس دستور کی بنیاد پر جو ریاست قائم ہوگی وہ اسلامی ریاست کہلائے گی اور وہ ریاست جو قوانین نافذ کرے گی وہ اسلامی قوانین ہوں گے۔

یہ بائیس نکاتی فارمولا ایک کنونشن میں متفقہ طور پر منظور کیا گیا جو جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا۔

اس فارمولے میں شامل چند اہم اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔

۲۔ موجودہ تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھال لیا جائے گا۔

۳۔ مملکت کا قیام شہریوں میں علاقائی، نسلی، قبائلی اور صوبائی تعصبات کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔

۴۔ شریعت کے تقاضے کے مطابق مملکت کا فرض ہوگا وہ قرآن وسنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے اور منکرات کو ختم کرے اور اپنے مسلم شہریوں کے لیے اسلامی تعلیمات کا انتظام کرے۔

۵۔ مملکت ملی یکجہتی کو فروغ دے گی اور اسلامی اخلاقی قدروں اور معیارات کو برقرار رکھے گی۔

۶۔ تقسیم اختیارات کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا اور عدلیہ کو انتظامیہ سے مکمل طور پر آزاد رکھا جائے گا۔

۷۔ مملکت میں بسنے والے شہریوں کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جس کی ضمانت انہیں شریعت دیتی ہے۔

۸۔ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہوں گے اور قانون سب کی یکساں طور پر حفاظت کرے گا۔

۹۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو قانونی حدود کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروکاروں کو اپنی فقہ کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان کے اپنے قاضی یہ فیصلہ کریں۔

۱۰۔ غیر مسلم شہریوں کو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے مذہب وعبادت، تہذیب وثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی۔ انہیں اپنے شخصی معاملات کے فیصلے اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

اس فارمولے پر دستخط کرنے والی نامور شخصیات میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد ادریس کاندہلویؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ظفر احمد انصاریؒ، مولانا راغب احسنؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، مفتی جعفر حسین مجتہدؒ اور مولانا عبدالحامد بدایونیؒ جیسے حضرات کا ذکر آتا ہے۔

ان بائیس نکات میں سے کچھ نکات کو دستور سازی کے دوران قبول کر لیا گیا اور وہ دستور میں شامل کر لیے گئے۔ لیکن کچھ نکات ایسے بھی تھے جن سے شاید اس وقت کے پاکستان کے سیاسی قائدین نے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا ذہن ان نکات پر مطمئن نہیں تھا، یا ان کو ایسے اعتراضات تھے جن کا ان کو جواب نہیں ملا یا ان کی کچھ اور مصلحتیں تھیں۔ یہ سارے اسباب بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں سے بعض دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ جن نکات پر اتفاق رائے ہوا ان میں سے ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ دستور میں واضح طور پر لکھا جائے کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت سے متعارض نہیں بنایا جائے گا اور اگر بنا دیا جائے تو اسے ایک خاص طریق کار (MECHANISM) کے ذریعے چیلنج اور منسوخ کیا جا سکے گا اور جو قوانین پہلے سے پاکستان میں رائج ہیں، ان کو ایک خاص مقررہ مدت کے اندر اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے گا۔ یہ واضح اعلان و وعدہ بلکہ التزام (COMMITMENT) پاکستان کے دستور میں ۱۹۵۲ء سے آج تک لکھا جا رہا ہے اور اس وقت بھی لکھا ہوا ہے۔

قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کا اختیار کسے ہو؟

پاکستان میں اس بات پر تو کبھی اختلاف نہیں ہوا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں اور جو سابقہ قوانین موجود ہیں انہیں اسلام کے مطابق بنا لیا جائے۔ لیکن اس کام کا طریقہ کیا ہو؟ اس کے بارے میں پاکستان میں بحث ہوتی رہی ہے۔ دنیائے اسلام کے کئی اور ممالک میں بھی یہ سوال پیدا ہوا۔ اس کے لیے مختلف تجاویز اور تدابیر اختیار کی گئیں۔ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ اس کام کے لیے جید علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے اور جب کوئی قانون اسمبلی میں زیر بحث آئے یا کسی قانون کے بارے میں سوال پیدا ہو کہ یہ شریعت سے متعارض ہے یا نہیں تو اسے اس بورڈ کو بھیج دیا جائے اور جو فیصلہ وہ بورڈ کرے اس کے مطابق زیر بحث معاملہ کو طے کر لیا جائے۔ لیکن یہ تجویز ایسی تھی جس پر بعض دینی قائدین نے بھی چند تحفظات کا اظہار کیا اور بیشتر سیاسی قائدین نے بھی اس سے اتفاق نہیں کیا۔ سیاسی قائدین کا اعتراض یہ تھا کہ ایسا کرنا جمہوری اقدار کے خلاف ہے۔ اس لیے پارلیمنٹ کو جو عوام کی مجاز نمائندہ اور ترجمان ہے، مکمل طور پر بااختیار ہونا چاہیے اور اس کے فیصلوں کے اوپر ایک نامزد مجلس کو، خواہ وہ کتنے ہی جید اہل علم حضرات پر مشتمل ہو، مقرر کرنا اور اسے پارلیمنٹ کے فیصلوں کی منسوخی کا اختیار دینا، جمہوری تصورات کے خلاف ہے، اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔

دینی قائدین کو جو تحفظات تھے ان کا اظہار بہت سے حضرات نے کیا۔ علماء اور دینی قائدین انفرادی اور اجتماعی طور پر جس خدشے کا اظہار کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ اگر یہ اختیار حکومتوں کو دے دیا جائے کہ وہ بورڈ قائم کریں تو پھر اس بات کی بڑی گنجائش ہے کہ حکومتیں اپنی پسند کے مولویوں اور دین فروشوں کو مقرر کر دیں اور جس چیز کو چاہیں شریعت سے متعارض اور جس چیز کو چاہیں شریعت سے ہم آہنگ قرار دلوالیں۔ ان

سے چاہیں تو بینک کے سود کو منافع کے نام پر جائز کروالیں اور چاہیں تو انشورنس اور بیمہ کی تمام رائج الوقت صورتوں کو جائز کروالیں۔

تاہم یہ تجویز پاکستان کے دوسرے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین مرحوم نے قبول کرلی۔ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۵۲ء کو جو مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا تھا اس میں یہ تجویز شامل کرلی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان میں مرکز اور ہر صوبے میں ایک ایک بورڈ ہوگا جس میں پانچ پانچ علماء ہوں گے۔ مرکز میں اسے صدر مقرر کرے گا اور صوبوں میں بورڈوں کا تقرر گورنر کریں گے۔ جب بھی نئے انتخابات منعقد ہوں گے اور اسمبلی بنے گی تو اس کے ساتھ ہی علماء کا نیا بورڈ بھی وجود میں آجائے گا۔ اس پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور دوسرے بہت سے حضرات نے اعتراض کیا۔ مولانا مودودیؒ نے کراچی میں وکلاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر الیکشن کے بعد جب سیاسی افراتفری مچے گی اور جو مولوی الیکشن ہار جایا کریں گے وہ گورنروں اور صدر کے پیچھے پھرا کریں گے اور ان مذہبی بورڈوں میں جگہ لینے کی کوشش کریں گے پھر اپنی نامزدگی کروا کے ہر جائز اور ناجائز کام میں حکومتوں کی تائید کیا کریں گے، اس لیے یہ تجویز ہمیں قبول نہیں ہے۔

اس تجویز پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس کے نتیجہ میں ابہام اور فکری ژولیدگی جنم لے گی۔ یاد رہے کہ اس وقت پاکستان میں نو صوبے تھے۔ آٹھ صوبے مغربی پاکستان میں تھے، ایک صوبہ مشرقی پاکستان تھا اور دسواں حصہ مرکز تھا۔ یوں علماء کے دس بورڈ بنتے تھے۔ اعتراض کرنے والے حضرات کا کہنا تھا کہ یہ پچاس علماء مختلف فتوے دیں گے۔ ایک چیز پنجاب میں جائز ہوگی اور بہاولپور میں ناجائز۔ مشرقی بنگال میں مستحب ہوگی اور مرکز میں حرام۔ اس سے شریعت ایک مضحکہ بن کر رہ جائے گی۔

سیاسی قائدین کی طرف سے دوسری متبادل تجویز یہ آئی کہ یہ اختیار پارلیمنٹ کو دے دیا جائے کہ وہ جس قانون کے بارے میں طے کرے کہ وہ شریعت سے متعارض نہیں ہے، اس کو باقی رہنے دیا جائے۔ اس تجویز کی تائید میں یہ کہا گیا کہ پارلیمنٹ اگر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوگی تو عوام اگر اسلام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے حق میں ہوں گے وہ یقیناً ایسے لوگوں کو منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجیں گے جو شریعت کا علم رکھتے ہوں اور شریعت سے مخلص ہوں۔ ایسے منتخب نمائندے شریعت کے خلاف کسی قانون کو پاس نہیں ہونے دیں گے اور موجود غیر اسلامی قوانین کو منسوخ یا تبدیل کروادیں گے۔ اس لیے عوام کو اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ اختیار پارلیمنٹ کو ملے۔ اس تجویز کے علمبردار اس دور کے سیاسی قائدین تھے آج بھی اکثر سیاسی قائدین یہی بات کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی بعض تحفظات اور ضمانتوں کے ساتھ اس طرح کی تجویز پر غور کرنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے اپنے خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں پارلیمنٹ کے ذریعہ اجتماعی اجتہاد کیے جانے کو دور جدید کے بہت سے مسائل کا حل بتایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پارلیمنٹ میں علماء کی مؤثر شرکت کے عمل کو یقینی بنایا جائے۔ لیکن افسوس کہ علامہ اقبالؒ کے ان افکار پر کوئی سنجیدہ توجہ نہیں دی گئی۔

تاہم اس دور کے دینی قائدین نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور اصرار کیا کہ یہ اختیار پالیمنٹ کو نہ دیا جائے، کیونکہ ان کو اس بات کا شدید خدشہ تھا کہ پارلیمنٹ میں جو حضرات منتخب ہو کر آئیں گے وہ اپنے علم دین، کارکردگی اور اپنے اخلاقی معیار کے اعتبار سے اس اعلیٰ سطح پر فائز نہیں ہوں گے کہ ان کے اجتہادات کو عوام میں وہ پذیرائی حاصل ہوسکے جو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ جیسے بزرگوں کے اجتہادات کو حاصل ہوئی۔ مخلص اور متقی اہل علم کی شرکت کے بغیر پارلیمنٹ کے اجتہاد کی وہی حیثیت ہوگی جو اکبر کے دین الٰہی اور ابوالفضل اور فیضی کے خیالات کو حاصل ہوئی تھی۔

اسی اثناء میں ایک تیسری تجویز بھی سامنے آئی جو پہلی دونوں تجاویز کے مقابلہ میں زیادہ معتدل اور متوازن تھی۔ یہ تجویز مذکورہ بالا ۲۲ نکات پر دستخط کرنے والے تمام علمائے کرام نے بالاتفاق ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء اور پھر ۱۹۵۳ء میں پیش کی۔ تجویز یہ تھی کہ یہ اختیار نہ تو علماء کے کسی بورڈ کو دیا جائے اور نہ پارلیمنٹ کو، بلکہ یہ اختیار اعلیٰ عدلیہ کو دے دیا جائے۔ ان حضرات نے کہا کہ دنیا کے تمام وفاقی ممالک میں سپریم کورٹ یا اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایسے قانون کو جو دستور کے خلاف ہو یا ایسا حکم نامہ جو ملک کے بنیادی قانون سے متعارض ہو اس کو منسوخ کر سکتی ہیں۔

اگر قرآن وسنت پاکستان کا سپریم قانون ہو یا قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی کرنا ریاست کی آئینی ذمہ داری ہو تو پھر پاکستان میں سپریم کورٹ کو یہ اختیار خود بخود حاصل ہونا چاہیے کہ وہ کسی ایسے قانون کو جو قرآن وسنت سے ہم آہنگ نہ ہو، کالعدم قرار دے سکے۔ امریکہ میں بھی یہ اختیار سپریم کورٹ کے پاس ہے اور ۱۷۷۹ء سے لے کر جب سے امریکی دستور بنا ہے، ۱۱۴ سے زائد قوانین کو منسوخ کیا جا چکا ہے، حالانکہ وہ قوانین کانگریس نے منظور کیے تھے۔ لہٰذا ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ پاکستان میں بھی شریعت کے معاملہ میں یہ اختیار سپریم کورٹ کو دے دیا جائے۔

۱۹۵۴ء میں جب مرحوم محمد علی بوگرہ وزیر اعظم تھے انہوں نے یہ اختیار سپریم کورٹ کو دینا منظور کر لیا اور ۱۹۵۴ء میں جو دستور تیار ہوا اس کے آرٹیکل چار میں لکھ دیا گیا کہ سپریم کورٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی شہری کی درخواست پر کسی بھی ایسے قانون کو کالعدم قرار دے دے جو سپریم کورٹ کے خیال میں شریعت سے متعارض ہو۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی جس کی نظیر نہ آج کے دور میں ملتی ہے اور نہ ماضی قریب میں ملتی تھی۔ ایک انتہائی اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ علماء نے یہ اہم حق روایتی مذہبی اسکالروں یا علماء کے بجائے ججوں کی ایک ایسی جماعت کو دینے پر اتفاق کیا تھا جو اینگلو سیکسن قانونی روایات میں تربیت یافتہ تھے۔ یہ حق کسی دوسرے اسلامی ملک کی جدید عدلیہ کو اس انداز میں کبھی نہیں دیا گیا۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ایران کے ۱۹۰۶ء کے آئین میں اور آیت اللہ خمینی کے جدید ایران کے آئین میں بھی مذہبی علماء پر مشتمل اداروں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ کون کون سے قوانین شریعت کے منافی ہیں اور کون سے منافی نہیں ہیں۔ سعودی عرب میں بھی اسی نوع کا ایک ادارہ "هيئة كبار العلماء" یا باڈی آف دی سنیئر علماء کا قیام عمل میں آیا۔ یہ دونوں ادارے زیادہ تر ایسے روایتی علماء کی نمائندگی کرتے ہیں جو جدید علوم میں کوئی پس منظر نہیں رکھتے۔

۱۹۵۴ء کے اس مسودہ آئین میں سپریم کورٹ کو دیئے گئے اس اہم دائرہ اختیار سے مالیاتی قوانین کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ ان قوانین کے بارے میں ذمہ دار حضرات کا کہنا تھا کہ ملک کا نظام سود پر استوار ہے اور یہ لعنت اتنی جاگزیں ہو گئی ہے کہ ایک دو سالوں میں اس کا متبادل تلاش کرنا دشوار ہے۔ اس لیے حکومت پاکستان کو وقت دیا جائے۔ تحقیق وتفتیش کے بعد جب سود کے متبادل تلاش کر لیے جائیں گے تو مالیاتی قوانین کے بارے میں بھی یہ اختیار سپریم کورٹ کو دے دیا جائے گا۔ حکومت نے جب دستور تیار کر کے اسمبلی میں پیش کیا تو یہ استثناء پچیس سالوں کے لیے مانگا تھا۔ اس دستور کی حتمی منظوری کے لیے ایک خاص دن بھی مقرر ہو گیا تھا۔

لیکن افسوس کہ اس دستور کی منظوری سے قبل ہی ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اس وقت کے گورنر جنرل محمد غلام مرحوم نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور یہ ساری کامیابی جو بالکل آخری مرحلے تک پہنچ چکی تھی صفر کے درجے پر آ گئی۔

۱۹۵۶ء کا دستور

پھر جب خدا خدا کر کے ۱۹۵۶ء میں دستور پاکستان بننے لگا تو اس وقت کے سیاسی قائدین نے پھر اس بات پر اصرار کیا کہ کسی قانون کو شریعت کے منافی قرار دینے کا اختیار صرف پارلیمنٹ ہی کو حاصل ہونا چاہیے۔ ان حالات میں کسی بڑے اختلاف سے بچنے کے لیے ایک درمیانی راستہ کے طور پر طے کیا گیا کہ کسی قانون کے خلاف شریعت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کا اصل آئینی اختیار تو اسمبلی ہی کو ہو، البتہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو مشورے دینے کے لیے ماہرین پر مشتمل ایک ''اسلامک لاء کمیشن'' بنا دیا جائے، جو رائج شدہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اقدامات کی سفارش کرے اور جب کوئی قانون پارلیمنٹ میں زیر بحث ہو اور اس کے بارے میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ وہ شریعت سے ہم آہنگ ہے یا نہیں تو وہ قانون بھی اس ادارے کو بھیج دیا جائے اور ادارے کی ماہرانہ رائے آنے کے بعد اس قانون کے بارے میں فیصلہ کر دیا جائے۔

اس ضمن میں ۱۹۵۶ء کے دستور میں جو دفعات رکھی گئی تھیں وہ اتنی غیر مؤثر تھیں کہ ان کا عملی طور پر ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ اس دستور کے نفاذ کے ایک سال کے اندر اندر صدر ایک اسلامک لاء کمیشن بنائے گا جس کے فرائض یہ ہوں گے کہ وہ اسلامی قوانین واحکام کو مناسب صورت میں مرتب کرے، رائج الوقت قوانین کا جائزہ لے اور اسمبلی کے ریفرنس کا جواب دے وغیرہ وغیرہ۔ کمیشن کی رپورٹ حتمی ہو یا وقتی، اسمبلی کے سامنے پیش کر دی جائے گی اور اسمبلی اس سلسلے میں قوانین بنائے گی۔ یہ سوال کہ اسمبلی کمیشن کی تجاویز کو منظور کر لے گی یا نہیں؟ مسترد کر دے گی یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسمبلی کو کھلی آزادی تھی کہ چاہے تو وہ کمیشن کی رپورٹ کو ایک طرف رکھ دے اور قطعاً کوئی کارروائی نہ کرے اور چاہے تو قانون بنا دے کہ مثلاً ساری رپورٹیں مسترد کی جاتی ہیں۔ صدر پاکستان نے جو کمشن ایک سال کے اندر اندر قائم کرنا تھا وہ آئین کی پوری مدت کے دوران کبھی قائم نہیں ہوا۔ اور اس نے ایک دن کے لیے بھی کام شروع نہیں کیا۔

۱۹۵۶ء کے آئین میں قرارداد مقاصد کو دستور کے مقدمہ طور پر اختیار کیا گیا تھا اور علماء کرام کے ۲۲ نکاتی فارمولے میں سے بہت سی باتوں کو مملکت کی پالیسی کے راہنما اصولوں کے طور پر شامل کر لیا گیا تھا۔ آئین میں یہ کہا گیا تھا کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھال دیا جائے گا۔ آئین کے حصہ دوازدہم جسے ''عمومی احکام'' کا عنوان دیا گیا تھا، اس میں اسلامی تحقیق ومطالعہ کے لیے ایک ادارے کے قیام کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کا ملکی آئین میں شامل کیا جانا شاید کسی طرح بھی ضروری نہ تھا۔ ایسے ادارے دنیا کے ہر ملک میں ہوتے ہیں اور ملک کے دستور میں ان کا کہیں بھی تذکرہ نہیں ہوتا۔ شاید اسلامی عناصر کی اشک شوئی کی خاطر ایسی بے ضرر دفعات شامل کیا جانا قرین مصلحت سمجھا گیا ہو۔ یوں بھی آئین کی پوری مدت کے دوران یہ ادارہ کبھی وجود میں نہیں آیا۔

پاکستان کا یہ پہلا باقاعدہ دستور جو تقریباً ۹ سال کے عرصہ بعد بنا وہ تیس ماہ سے زائد مدت تک نافذ نہ رہ سکا اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں یہ دستور منسوخ کر دیا گیا۔ اس عرصہ کے دوران ۱۹۵۶ء کے دستور کے تحت قوانین کو اسلامیانے کے حوالے سے سرے سے کوئی کام نہیں ہوا۔

مسلم عائلی قوانین

اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء کے نفاذ پر ۱۹۵۶ء کے آئین کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک ۴۴ ماہ سے زائد عرصہ تک ملک پر بغیر کسی آئین کے حکومت کا نظام چلتا رہا۔ اس عرصہ میں مارشل لاء حکومت نے ایک ایسا اہم قدم اٹھایا جس نے عائلی قوانین کے میدان میں شریعت کے نفاذ پر گہرا اثر چھوڑا۔ ۱۹۶۱ء میں اس وقت کی حکومت مغربی پاکستان (اب پاکستان) نے نفاذ شریعت آرڈیننس جاری کیا جن کے مطابق مسلم عائلی قوانین سے متعلق تمام معاملات مثلاً شادی، طلاق، حضانت، وراثت، ہبہ اور وقف کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ یہ سب معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ ان موضوعات سے متعلق اسلامی احکام کو تحریری طور پر مدون کیے بغیر براہ راست شرعی قوانین نافذ کر دیئے گئے۔

قبل ازیں قیام پاکستان کے بعد اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں جو پہلا کام ہوا تھا وہ ۱۹۴۹ء میں ہوا، جب پاکستان کی مرکزی اسمبلی نے ایک قانون بنایا تھا جس میں یہ کہا گیا کہ پاکستان میں نکاح وطلاق کے مقدمات شریعت کے مطابق طے کیے جائیں گے بشرطیکہ دونوں فریق مسلمان ہوں اور وہ یہ مطالبہ کریں کہ وہ کسی رسم ورواج کے نہیں بلکہ شریعت کے مطابق مقدمات کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جائے گا۔ یہ پہلی پیش قدمی تھی جو ایک محدود دائرہ میں نکاح وطلاق کی حد تک تھی اور اس شرط کے ساتھ تھی کہ فریقین اپنی رضامندی سے خود یہ طے کریں کہ وہ اپنے معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کروائیں گے۔ اس صورت میں عدالت پابند ہوگی کہ ان کے مابین فیصلہ شریعت کے مطابق کرے۔ یہ ایک مختصر دوسطری قانون تھا جو ۱۹۴۹ء میں پورے پاکستان (مغربی اور مشرقی) پر نافذ کیا گیا اور بڑی کامیابی سے برسہابرس تک اس عمل درآمد ہوتا رہا۔

۱۹۶۲ء میں گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان مرحوم کے زمانہ میں مغربی پاکستان میں ایک اور قانون جاری کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی ایک فریق بھی اگر یہ مطالبہ کرے کہ وہ رائج الوقت قانون کی بجائے شریعت کے مطابق فیصلہ چاہتا ہے تو دوسرے فریق کے لیے بھی اس کو قبول کرنا لازم ہوگا اور فریقین کے معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جائے گا۔ سابقہ قانون کی رو سے بعد میں اس قانون کا دائرہ بڑھا کر نکاح، طلاق، وراثت، وصیت اور مختلف معاملات پر پھیلا دیا گیا۔ لیکن اس میں ایک استثناء موجود رہا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ والیان ریاست یا وہ لوگ جن کو اس قانون کی رو سے خاص استحقاق حاصل تھا، ان کے لیے وراثت کا قانون انگریزوں کے اصول ہی پر جاری رہے گا۔ وہ یہ تھا کہ نواب یا جاگیردار کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث ہوگا۔ اور سب سے بڑے بیٹے کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث بنے گا۔ اس میں چھوٹے بیٹوں، بیٹیوں، بہنوں سب کو ہر قسم کی جائیداد کے حق وارثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ قانون برصغیر میں کم وبیش سو سال جاری رہا اور آزادی کے بعد بھی طویل عرصہ تک پاکستان میں جاری رہا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خواتین کے حقوق کی علمبردار کسی تنظیم نے کبھی اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی۔ (کیا اس لیے کہ اس قانون کو انگریزی استعمار کی سند حاصل تھی؟)۔

عائلی قوانین کے شعبہ میں ۶۲۔۱۹۶۱ء میں ایک اہم قانون سازی ہوئی۔ یہ مسلم عائلی قوانین آرڈیننس ۱۹۶۲ء کا نفاذ تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں جاری کردہ یہ آرڈیننس دینی اعتبار سے ایک قابل اعتراض قانون سمجھا جاتا رہا ہے۔ علماء کرام کا عام طور پر یہ کہنا تھا کہ

اس میں اسلامی روایتی نقطۂ سے انحراف کے علاوہ بھی اس میں بڑے خلاء اور خامیاں موجود ہیں، مثلاً پوتے کی میراث، طلاق اور دوسری شادی کے بارے میں بعض ایسے احکام جن کے حوالے سے یہ قانون متنازعہ بن گیا۔ اس قانون میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی مرد کو پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور اگر وہ پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرے گا تو انکاح رجسٹر نہیں کیا جائے گا اور غیر رجسٹرڈ شادی کو قانوناً جائز نہیں مانا جائے گا۔ اس آرڈیننس کو جدت پسندوں اور روایتی علماء دونوں کی انتہائی تائید اور تنقید حاصل رہی ہے۔ اوّل الذکر نے اسے دل و جان سے پسند کیا۔ پاکستان کی مغرب زدہ خواتین اس آرڈیننس کو اپنے حقوق کی حفاظت کا ایک بہت بڑا ذریعہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے برعکس مؤخر الذکر طبقہ یعنی علماء نے اس آرڈیننس پر تنقید کی اور اسے جلد بازی میں اٹھایا گیا ایک ایسا قدم قرار دیا جو قرآنی نصوص کی مستند تشریحات سے ایک غیر ضروری انحراف سے عبارت تھا۔

۱۹۶۲ء کا دستور

صدر محمد ایوب خان مرحوم کی مارشل لاء حکومت نے ۱۹۶۲ء میں بالآخر ایک آئین نافذ کیا جو اسلامی شقوں کے اعتبار سے اپنی ترمیمی شکل میں عملاً ۱۹۵۶ء کے کالعدم قرار دیئے جانے والے آئین سے مختلف نہیں تھا۔ بلکہ ابتداء میں تو ۱۹۶۲ء کے آئین میں مملکت پاکستان کے نام کے ساتھ ''اسلامی'' کا لفظ بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ پھر شدید عوامی تنقید اور دباؤ کے نتیجہ میں اس میں پہلی آئینی ترمیم کے ذریعہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے الفاظ اختیار کیے گئے۔ اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب بھی قرار نہیں دیا گیا تھا اور اسلامی دفعات میں ''ہوں گے'' کے صیغہ کو ''ہونے چاہئیں'' میں تبدیل کر کے ان دفعات کی قانونی حیثیت کمزور کر دی گئی تھی۔ پھر ایک ترمیم کے ذریعہ اسلامی دفعات کی حیثیت کو کافی حد تک بحال کر دیا گیا۔

اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل

۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کا تصور دیا گیا تھا۔ یہ تصور کم و بیش اسی نمونے پر تھا جو ۱۹۵۶ء کے کالعدم آئین میں اسلامک لاء کمیشن کے تقرر کے بارے میں اپنایا گیا تھا۔ یہ کونسل پہلی بار ۱۹۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اوّل اوّل مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک جج جسٹس ابو صالح محمد اکرمؒ اس کے صدر نشین مقرر کئے گئے۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کے صدر شعبہ اسلامیات علامہ علاؤالدین صدیقیؒ اس کے سربراہ ہوئے۔ کونسل نے متعدد قوانین پر غور کر کے ان کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ کونسل یک طرفہ طور پر وقتاً فوقتاً اپنی سفارشات پیش کرتی رہی، لیکن نہ تو اس کی یہ رپورٹیں شائع کی گئیں اور نہ حکومت نے انہیں کبھی سنجیدگی سے لیا۔ ۱۹۷۴ء تک کونسل کی کسی رپورٹ کو کسی اسمبلی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا اور نہ اسمبلی نے ازخود کسی قانون میں تبدیلی کر کے اس شریعت کے مطابق بنانے میں دلچسپی لی۔ اس معاملہ میں اسمبلیوں کے علماء ارکان کی کارکردگی بھی روایتی مخالفانہ بیانات اور عوامی انداز کی نعرہ بازی سے زیادہ نہ تھی۔

بدکاری کا انسداد

البتہ اس دوران ۱۹۶۲ء میں گورنر پاکستان ملک امیر محمد خان مرحوم نے ایک ایسے آرڈیننس کا اجراء کیا جس کے تحت صوبہ مغربی پاکستان میں طوائفوں کے دھندے کو ممنوع قرار دیا گیا تھا اور اس پیشے کو قابل سزا جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دی گئی تھی۔ اگرچہ اس اقدام کی

کامیابی اور ناکامی کے بارے میں مختلف اندازے ہیں، لیکن خود یہ اقدام اپنی جگہ خوش آئند تھا اور اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملک کے اس وقت کے مشرقی حصہ میں ایسا کوئی اقدام نہیں کیا گیا تھا اور وہاں طوائفوں کے کاروبار کو ایک قانونی پیشے کی حیثیت حاصل رہی جس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

جب جنرل محمد یحییٰ خان کا مارشل لاء ملک میں نافذ ہوا تو مارچ ۱۹۶۹ء میں ۱۹۶۲ء کا آئین بھی کالعدم قرار دے دیا گیا۔ تاہم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ایک حکم کے ذریعے سابقہ آئین کے تحت قائم جملہ اداروں اور قوانین کو بدستور قائم رہنے دیا گیا۔ اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل نے بھی کام جاری رکھا۔ وہ گاہ بگاہ حکومت کو اپنی رپورٹیں بھیجتی رہی لیکن حسب معمول رپورٹیں بھیجنے کا عملاً کوئی فائدہ نہیں تھا اور نہ اس سے کچھ حاصل ہو رہا تھا۔

۱۹۷۳ء کا دستور اور اسلامی نظریاتی کونسل

۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد جب جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے حکومت سنبھالی تو ملک کے لیے ایک مستقل آئین تیار ہوا جو اگست ۱۹۷۳ء میں نافذ کیا گیا۔ اس آئین میں ایک بار پھر معمولی سے ردوبدل کے ساتھ وہی شقیں شامل کر لی گئیں جو ۱۹۵۶ء کے آئین میں شامل تھیں۔ کمیشن اور اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کے بجائے اب اس ادارہ کو کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی یا اسلامی نظریاتی کونسل کا نام دیا گیا۔ اس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم کو اس کا چیئر مین مقرر کیا گیا۔

اس کونسل نے ۱۹۷۴ء کے آغاز سے کام شروع کیا اور تین سال تک بڑی تندہی سے اسے جاری رکھا۔ کونسل نے حکومت کو بڑی مفید سفارشات پیش کیں اور معاشرے کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے لیے مختلف سرکاری اداروں کو بہت سے ایسے اقدامات کی تجاویز دیں جن سے یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

اس کونسل کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ایک جامع اسکیم بنائی تا کہ موجودہ قوانین پر اس خیال سے نظر ثانی کی جائے کہ انہیں اسلامی احکام سے ہم آہنگ بنایا جا سکے۔ اس نے پاکستان کوڈ (PAKISTAN CODE) پر ابتداءً نظر ثانی کرتے ہوئے کُل ۲۴ میں سے ۸ جلدوں کی نظر ثانی اور ان میں ترمیم واضافے کا کام مکمل کر لیا۔ یہ رپورٹیں حکومتِ وقت کو پیش کی گئیں جو نہ تو شائع ہوئیں اور نہ حکومت نے ان پر سنجیدگی سے کوئی غور کیا۔ عملاً ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۷ء کی تمام کونسلوں کی سفارشات سرد خانے ہی کی نذر ہوتیں رہیں۔ یہ سفارشات اس سرکاری خط وکتابت تک محدود رہیں جو کونسل اور حکومتِ وقت کی ایجنسیوں کے درمیان ہوئی اور بالآخر یہ تمام سفارشات و تجاویز متعلقہ سرکاری فائلوں میں دفن ہو گئیں۔ البتہ کونسل نے جو سفارشات امتناع شراب، گھوڑ دوڑ پر جوئے کے خاتمے، نائٹ کلبوں کی بندش اور جمعۃ المبارک کی تعطیل کے بارے میں دیں، حکومت نے اپریل ۱۹۷۷ء کے ہنگامہ خیز ایام میں ان کو منظور کر کے پاکستان میں شراب، گھوڑ دوڑ پر جوا اور نائٹ کلبوں پر پابندی لگا دی اور جمعہ کے دن ہفتہ وار عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔

قادیانی غیر مسلم اقلیت

تاہم معاشرے کو اسلامیانے کے ضمن میں ایک اہم قدم کا ذکر ضروری ہے جو اس عرصہ میں اٹھایا گیا۔ یہ قدم قادیانیوں کو غیر مسلم قرار

دینے کا تھا۔ اگرچہ اس معاملہ کا براہ راست نفاذِ اسلام سے تو اتنا واضح تعلق نہ تھا، لیکن یہ معاملہ ملّتِ اسلامیہ کی داخلی وحدت اور نظریاتی یکجہتی کے تحفظ سے براہ راست تعلق رکھتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد کئی بار اس مسئلہ نے شدّت اختیار کی، لیکن اس کے حل کی طرف کوئی مثبت قدم نہ اٹھ سکا، بالآخر ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ نے اس مسئلے پر پوری طرح غور و خوض کیا اور دونوں فریقین کو سننے کے بعد متفقہ طور پر چوتھا آئینی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۴ء میں منظور کر لیا، جس کی رو سے قادیانیوں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دوسرے ماننے والوں اور پیرو کاروں کو قانونی اور آئینی طور پر غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ اس ترمیم نے ایک ایسے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا جو پچھلے ۹۰ برسوں سے لوگوں کے ذہنوں کو پریشان کیے ہوئے تھا۔

۱۹۷۷ء کا مارشل لاء

جولائی ۱۹۷۷ء میں ملک میں پھر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ البتہ دستور ۱۹۷۳ء کو منسوخ نہیں کیا گیا بلکہ اسے معطل کر دینے پر ہی اکتفاء کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو کے مشہور مقدمے میں جو انہوں نے چیف آف آرمی سٹاف کے خلاف دائر کیا تھا، سپریم کورٹ نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی حکومت کو جائز قرار دے دیا اور اسے یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ قانون سازی کے علاوہ دستور میں جہاں ناگزیر ضرورت ہو، ترمیم بھی کر سکتے ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ اسلامیانے کے عمل کو تیز تر کر کے ملک میں خود بخود آگے بڑھنے والا ایک آئینی و قانونی نظام دیں گے اور یہ کہ اس نظام کے تحفظ اور تسلسل کو یقینی بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ بہت سے اہل علم اور دانشوروں سے ملے۔ اس مشاورت کے نتیجے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا۔ نو تشکیل شدہ کونسل کو فعال بنایا گیا اور ملک میں نفاذ اسلام کی ایک جامع حکمت عملی تیار کرنے کے کام کا آغاز ہوا۔

شریعت سے متعارض قوانین کی منسوخی کا اعلیٰ عدلیہ کو اختیار

جب بیگم نصرت بھٹو کیس میں عدالت عظمیٰ نے جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کو ''نظریہ ضرورت'' کی بناء پر جائز قرار دے دیا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ انتہائی ناگزیر ضرورت کے تحت وہ آئین میں ترمیم بھی کر سکتے ہیں تو اس فیصلے کی روشنی میں اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز پیش کی کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آئین میں ایسی ترامیم کر دیں جن کے ذریعہ اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ موجود قوانین کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھ سکیں اور ان قوانین کو منسوخ کر سکیں اور شقوں کو کالعدم قرار دے سکیں جو قرآن و سنّت کے احکام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز کو اصولی طور پر منظور کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے دستور میں ضروری ترامیم کر دیں اور ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء مطابق ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۰ھ کو ایک اہم دستوری ترمیم کے ذریعے یہ اختیار عدالتوں کو مل گیا۔

شریعت بنچوں کا قیام

۱۰ فروری ۱۹۷۹ء مطابق ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۰ھ کو ہونے والی اس ترمیم کے ذریعے چاروں ہائی کورٹوں میں ایک ایک شریعت بنچ اور سپریم کورٹ میں شریعت اپیلیٹ بنچ قائم کیا گیا جن کو اختیار دیا گیا کہ کسی بھی شہری کی درخواست پر کوئی بھی قانون ہائی کورٹ دیکھ سکتی ہے اور اس کا جائزہ لے سکتی ہے کہ کیا وہ قانون یا اس قانون کی کوئی شق اسلامی احکام کے منافی تو نہیں جیسا کہ قرآن حکیم اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں درج ہے۔ یہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا جو جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اٹھایا۔

اسلامیانے کے عمل کے دوران بیسویں صدی میں بلاشبہ کسی اسلامی ملک میں اٹھایا جانے والا یہ پہلا تاریخ ساز قدم تھا۔ یہ جرأت مندانہ قدم تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہنا چاہیئے کہ ایک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جس کے پاس کلی اختیارات تھے کہ وہ جیسے چاہے، نئے قوانین بنائے یا رائج الوقت قوانین اور دستور کو کالعدم قرار دے دے، اس نے جدید دنیائے اسلام کی تاریخ میں پہلی بار اعلیٰ عدلیہ کو یہ اختیار دیا کہ وہ پاکستان میں کسی بھی اتھارٹی کے بنائے ہوئے قانون کو منسوخ کر دے جس میں خود جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے بنائے ہوئے قوانین اور آرڈیننس بھی شامل تھے۔

عدلیہ کے اختیار سے مستثنیٰ امور

لیکن اس بڑے اقدام کے باوجود اس میں بعض بڑی خامیاں اور کمزوریاں رہ گئیں یا جان بوجھ کر چھوڑ دی گئیں۔

۱۹۵۴ء کے دستور میں شریعت کی روشنی میں قوانین کا جائزہ لینے کا اختیار سپریم کورٹ کو دیا گیا تھا اور یہ اختیار صرف ایک استثناء کے ساتھ تھا، اور وہ استثناء مالیاتی قوانین کا تھا۔ یہ استثناء بھی ایک محدود (اگرچہ طویل) مدت کے لیے تھا اور اس مدت کے گذر جانے کے بعد اس استثناء کو ہر حال میں ایک نہ ایک دن ختم ہو جانا تھا۔ اس کے برعکس جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے یہ اختیار عدلیہ کو پانچ استثناءات کے ساتھ دیا، جن میں سے ایک عارضی تھا اور چار مستقل تھے۔ جو چار مستقل استثناءات تھے ان میں ایک تو خود آئین تھا، ایک پرسنل لاز یعنی شخصی قوانین تھے، ایک استثناء پروسیجرل لاء کا تھا۔ اور ایک مارشل لاء کے ریگولیشن تھے۔ جو عارضی استثناء تھا وہ مالیاتی قوانین کا تھا اور ابتداً تین سال کے لیے کیا گیا تھا۔

۱۔ آئین کو عدلیہ کے اختیار سے مستثنیٰ قرار دینے کے بارے میں کہا گیا کہ آئین ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر ضروری ہے۔ آئین کے تحت شریعت بنچ قائم کیے جا رہے ہیں۔ جو چیز آئین ہی کے تحت پیدا کی جا رہی ہے وہ آئین کو کیسے منسوخ کر سکتی ہے۔ اگرچہ اس دلیل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس پر بحث بھی کی جا سکتی ہے، تاہم اس استثناء کی پشت پر ایک حد تک کوئی نہ کوئی دلیل موجود تھی۔

۲۔ پرسنل لاء اور پروسیجرل لاء یعنی شخصی قوانین اور ضابطہ کے قوانین کو عدلیہ کے اختیار سے مستثنیٰ قرار دینے کی تائید میں کوئی معقول دلیل نہ اس وقت دی گئی تھی اور نہ آج دی جا رہی ہے۔

۳۔ مارشل لاء ریگولیشن اور مارشل لاء آرڈر کے بارے میں یہ کہا گیا کہ سپریم کورٹ نے مارشل لاء کو دستور میں ترمیم کا اختیار دیا ہے۔ مارشل لاء دستور میں ترمیم کسی مارشل لاء ریگولیشن یا آرڈر کے ذریعے کرتا ہے۔ اگر کسی مارشل لاء ریگولیشن یا آرڈر کو شریعت کے منافی قرار دے کر اسے ہی منسوخ کر دیا جائے تو مارشل لاء آرڈر کے ذریعے قائم شریعت بنچ بھی ختم ہو جائیں گے۔ لہذا مارشل لاء ریگولیشن اور آرڈر کو بھی عدلیہ کے اس اختیار سے باہر رکھا [illegible] ہے۔ اس دلیل کی کمزوری بھی واضح ہے اور اس سے بھی اتفاق ضروری نہیں ہے۔

۴۔ مالیاتی قوانین کا استثناء [illegible] تین سال کے لیے تھا۔ کہا یہ گیا کہ پاکستان میں شریعت سے متعارض تمام مالیاتی قوانین کو تین سال کے اندر بتدریج تبدیل کر کے شریعت کے مطابق بنا دیا جائے گا اور جیسے ہی مالیاتی قوانین اور معاشی نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کا یہ عمل مکمل ہو گا یہ اختیار بھی عدالتوں کو دے دیا جائے گا کہ رائج الوقت مالیاتی قوانین کو شریعت کے معیار پر پرکھ سکیں۔

ان پانچ استثناء کے علاوہ بقیہ تمام قوانین جن میں دیوانی قانون، فوجداری قانون اور قانون تجارت جیسے اہم شعبہ ہائے قانون شامل

تھے سب شریعت بنچوں کے دائرہ اختیار میں آ گئے اور ان پر شریعت بنچوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ فروری ۱۹۷۹ء سے لے کر ۲۶ مئی ۱۹۸۰ تک چاروں ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ کام کرتے رہے اور انہوں نے تیزی سے مقدمات نمٹانے شروع کیے۔

حدود آرڈیننس کا نفاذ

اسلامی نظریاتی کونسل نے چودہ ماہ سے زائد عرصہ کے مسلسل کام اور پرجوش کوشش کے بعد پانچ ایسے مسودات قوانین کی سفارشات تیار کیں جن کا تعلق جائیداد کے تحفظ اور معاشرے کی اخلاقیات کی حفاظت سے تھا۔ ان سفارشات کے ذریعے چوری، ڈاکہ زنی، زنا، قذف اور شراب نوشی وغیرہ جرائم سے متعلق مروجہ قوانین کو بدل کر اسلامی قوانین کا نفاذ کر دیا گیا تھا اور ان جرائم کے ارتکاب پر قرآن وسنت کی مقرر کردہ سزائیں نافذ کر دی گئیں۔

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ایک حکم کے ذریعے مندرجہ ذیل حدود آرڈیننس جاری کیے:

۱۔ جائیداد سے متعلق جرائم (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء
۲۔ جرم زنا (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء
۳۔ جرم قذف (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء
۴۔ حکم امتناع (نفاذ حدود) آرڈیننس ۱۹۷۹ء
۵۔ سزائے تازیانہ کا آرڈیننس ۱۹۷۹ء

مندرجہ بالا پانچوں حدود آرڈیننس کو ۱۹۸۵ء میں کی گئی آٹھویں ترمیم کے ذریعے آئینی تحفظ حاصل ہو گیا۔ حدود قوانین کے نفاذ کے بارے میں اندرون اور بیرون ملک بہت پراپیگنڈہ کیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ حدود قوانین سے خواتین کے حقوق پر زد پڑی ہے، ان پر ظلم وستم کا راستہ کھل گیا ہے، مردوں کو خواتین پر مزید دست اندازی کا موقع مل گیا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان قوانین کی وجہ سے خواتین پر اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے (اور بعض زیادتیاں واقعتاً ہوئی ہیں) تو اس کے ذمہ دار نہ حدود قوانین ہیں اور نہ شریعت کے احکام، بلکہ اس کے ذمہ دار خاص طور پر مندرجہ ذیل دو عوامل ہیں:

۱۔ ایک عامل تفتیشی ایجنسیوں کا وہ فساد اور کرپشن ہے جس سے پاکستان کا ہر شہری بخوبی واقف ہے۔ پولیس پاکستان میں جرائم کی تفتیش کرتی ہے وہی حدود قوانین کی تفتیش بھی کرتی ہے اور اس کی تفتیش کا جو انداز ہے اس سے کوئی پاکستانی ناواقف نہیں ہے۔ زیر تفتیش قیدیوں پر جتنے مظالم پولیس کرتی ہے اور برس سے کرتی آ رہی ہے انہیں زبردستی حدود قوانین کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے، نتیجتاً اسلام دشمن عناصر شریعت اور اسلامی قوانین کو بدنام کرتے ہیں۔ بے گناہ قیدی ہزاروں کی تعداد میں پہلے بھی پولیس اور جیل حکام کی زیادتیوں کا شکار ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ خواتین کے خلاف تھانوں، دارالامانوں، حوالاتوں اور جیلوں میں جو بدتمیزیاں پہلے کی جاتی تھیں، وہ آج بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن آج جو کچھ ہوتا ہے اسے حدود قوانین کے کھاتے میں ڈال کر کچھ لوگ شریعت کو بدنام کرنے کی مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۲۔ دوسرا عامل پروسیجرل لاء یعنی قانون ضابطہ ہے جس کو پاکستان میں عدلیہ کے ارکان اور وکلاء کے اصرار پر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے تحفظ دیا اور اسے وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا۔ آج بھی یہ قانون وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ ہے۔ اس پروسیجرل لاء میں اس طرح کے خلاء موجود ہیں کہ قانون کے مطابق جرم کی ساری تفتیش کرنا اور مجرم کو پکڑ کر سزا دینا کم از کم ہمارے موجودہ معاشرہ میں تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم یہ کہیں کہ ہمارا پروسیجرل لاء ناکام ہوگیا ہے، کچھ لوگ بدنیتی سے یہ کہتے ہیں کہ شریعت کے قوانین ناکام ہوگئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شریعت کے قوانین ناکام نہیں ہوئے بلکہ پاکستان کا ضابطہ فوجداری ناکام ہوگیا ہے۔ پاکستان کے قانون تعزیرات کی کوئی ایک دفعہ بھی ایسی نہیں ہے جس پر کما حقہ ضابطہ فوجداری (کریمنل پروسیجر کوڈ) نے عمل کرایا ہو۔

دوسرے محرکات کے علاوہ یہ وہ دو بنیادی محرکات ہیں جن کی وجہ سے حدود قوانین کا نفاذ درست طور پر نہیں ہوسکا اور اس کے ثمرات سامنے نہیں آسکے۔ لیکن اس ساری ناکامی کو دانستہ طور پر بدنیتی اور اسلام دشمنی میں حدود آرڈیننس کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور خواتین میں یہ غلط فہمی پیدا کردی جاتی ہے کہ حدود کے قوانین نے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

حدود آرڈیننس کس طرح پاکستان کے پروسیجرل لاء کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، لیکن تمہیدی طور پر یہ بات ذہن میں رہے کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ شخص (مرد یا عورت) بدکاری کا ارتکاب کرے تو اسے سنگسار کیا جائے گا۔ پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم نے مسلم فیملی لاز آرڈیننس جاری کیا تھا جو دینی اعتبار سے بڑا قابل اعتراض قانون قرار دیا گیا۔ اس قانون میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی مرد پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ اگر وہ پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرے گا تو اس کو رجسٹر نہیں کیا جائے گا اور قانوناً اس کو جائز نہیں مانا جائے گا۔ اس قانون کو سامنے رکھیں اور حدود قوانین کی اس دفعہ کو بھی ذہن میں رکھیں جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ شخص مرد یا عورت بدکاری کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا بذریعہ سنگساری سزائے موت ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ ایک خاتون کو اس کے شوہر نے زبانی طلاق دے دی۔ نہ تو اس طلاق کا کوئی ریکارڈ رکھا اور نہ اس کی کوئی رجسٹریشن کرائی۔ وہ خاتون اپنے والدین کے گھر آگئی۔ کچھ مدت کے بعد اس نے دوسری جگہ شادی کرلی۔ یہ دوسرا شوہر مالدار تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اس نے تیسری جگہ شادی کرلی۔ خاتون نوجوان اور کم عمر تھی اور اب کافی مالدار بھی ہوگئی تھی۔ پہلا شوہر جس نے اسے طلاق دے دی تھی اس کو شیطان نے بہکایا اور اس نے تیسرے شوہر کے خلاف مقدمہ دائر کردیا کہ فلاں شخص نے میری بیوی کو اغواء کرلیا ہے، وہ ناجائز طور پر اس کے ساتھ رہتا ہے، اس سے اس کے تین چار بچے بھی ہیں، جو اس بات ثبوت ہے کہ اس نے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کیا ہے۔ اس شکایت پر اس بے گناہ خاتون کو گرفتار کرکے اس کے خلاف بدکاری کا مقدمہ دائر کردیا گیا۔ کراچی کی ٹرائیل کورٹ نے مسلم فیملی لاز آرڈیننس اور حدود قوانین دونوں کو سامنے رکھا۔ مسلم فیملی لاز آرڈیننس میں تھا کہ اگر طلاق رجسٹر نہ کی جائے تو وہ شادی شمار نہیں ہوگی۔ ان دونوں وجوہ سے کورٹ نے پہلی طلاق کو جائز شمار نہیں کیا اور اس خاتون کو پہلے شوہر کی بیوی قرار دیا۔ اور تیسرے شوہر سے اس کی شادی کو بھی اس لیے جائز قرار نہیں دیا کہ اس کی رجسٹریشن نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا دوسرا نکاح بھی کالعدم اور پہلی طلاق بھی کالعدم۔ چونکہ پہلی طلاق کالعدم تھی اس لیے وہ خاتون پہلے شوہر کی بیوی قرار پائی اور جتنا وقت وہ دوسرے اور تیسرے شوہر کے ساتھ رہی وہ سارے تعلقات ناجائز قرار پائے اور وہ اولاد بھی ناجائز قرار دی گئی۔ اس بناء پر اس خاتون کو سزائے

موت بذریعہ رجم سنادی گئی۔ اس پر اندرون ملک اور بیرون ملک بڑی لے دے ہوئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زیادتی کا ذمہ دار، کون ہے؟ یقیناً اس کا ذمہ دار اسلام نہیں بلکہ پاکستان کے رائج الوقت قوانین ہیں۔ جیسے ہی یہ فیصلہ دیا گیا اس کے خلاف وفاقی شرعی عدالت میں اپیل دائر کردی گئی۔ وفاقی شرعی عدالت نے فوراً اس سزا کو کالعدم قرار دے دیا۔ نہ صرف فیصلہ کالعدم قرار دیا بلکہ جس ماتحت عدالت نے یہ فیصلہ سنایا تھا اس کے خلاف ناپسندیدگی کے ریمارکس بھی دیئے۔ اس کو شریعت سے ناواقفیت پر مبنی قرار دیا اور کہا کہ شریعت میں طلاق اسی لمحے مؤثر ہو جاتی ہے جس لمحے زبان سے الفاظ ادا کیے جائیں۔ رجسٹریشن ہونا یا نہ ہونا محض ایک انتظامی مسئلہ ہے۔ طلاق دینے والے شوہر کو طلاق کی رجسٹریشن نہ کرانے کی کوئی سزا بیشک دیں لیکن طلاق بہر حال مؤثر ہوگی۔

چنانچہ بعد میں دیگر عدالتوں نے بھی اس معاملہ کو لیا اور اعلیٰ عدالتوں نے اس کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ دوسرا نکاح رجسٹر کرایا جائے یا نہ کرایا جائے وہ جائز نکاح مانا جائے گا۔ طلاق رجسٹر کرائی جائے یا نہ کرائی جائے وہ مؤثر ہوگی اور اس وقت سے مؤثر ہوگی جب اس کے الفاظ ادا کیے گئے۔

اب اس خاتون پر ہونے والے ظلم و زیادتی کا ذمہ دار صدر محمد ایوب خان مرحوم کے زمانے میں بنایا جانے والا مسلم فیملی لاز آرڈیننس تھا اور وہ پروسیجر تھا جس کے تحت یہ فیصلہ دیا گیا۔ وفاقی شرعی عدالت نے اس خاتون کو انصاف دیا۔ بات یہاں ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن ان سب چیزوں کو نظر انداز کر کے بعض لوگ شریعت کو بدنام کرنے اور اس کے خلاف طوفان اٹھانے پر تلے رہے۔ مشرق سے مغرب تک، یورپ سے امریکہ تک اور پاکستان میں اسلام کے خلاف ایک فضا پیدا کردی گئی۔ پاکستان میں ایک طبقہ ایسا ہے جو شریعت کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

تعمیر مکان کے لیے قرضوں پر سود کا خاتمہ

یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے تعمیر مکان کے لیے حاصل کردہ قرضوں پر سود ختم کردیا گیا اور اس کی جگہ متبادل اسکیم رائج کی کہ مکان کی تعمیر لاگت اور اس کے ماہوار کرایہ کا تعین کر کے کارپوریشن تعمیری لاگت میں سے اپنی جاری کردہ رقم کی نسبت سے اپنا حصہ ماہوار کرائے کی رقم سے وصول کیا کرے گی۔ یوں اس قرضہ کو شراکت کے اصول پر کردیا گیا۔ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ اور انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان نے بھی سودی کاروبار ترک کر کے نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر کام شروع کردیا۔

وفاقی شرعی عدالت کا قیام

شریعت بنچوں کے ایک سال (۱۹۷۹ء۔۱۹۸۰ء) کے تجربے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ بجائے اس کے چار مختلف ہائی کورٹوں میں چار شریعت بنچ ہوں، ایک مستقل عدالت قائم کردی جائے جو چاروں ہائی کورٹوں کی نمائندہ ہو۔ چار شریعت بنچوں کے کام کرنے سے بعض مسائل بھی سامنے آئے۔ مثلاً ایک دشواری یہ تھی کہ ایک ہی مسئلہ پر متضاد فیصلے اور تشریحات ہو رہی تھیں۔ مثلاً لاہور ہائی کورٹ میں ایک درخواست دائر کی گئی کہ پاکستان میں شفعہ کے قانون کی وہ دفعہ شریعت سے متعارض ہے جس میں مزارع کو حق شفعہ دیا گیا ہے۔ لاہور ہائی کورٹ نے طے کیا کہ مزارع کو حق شفعہ دیا جانا چاہیے اور اسے یہ حق نہ دیا جانا شریعت سے متعارض ہے، چنانچہ یہ قرار دیا گیا کہ قانون جائز اور شریعت کے مطابق ہے۔

پشاور ہائی کورٹ میں بھی اسی طرح کا ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔ وہاں کے شریعت بنچ نے قرار دیا کہ مزارع کو حق شفعہ دینا جائز نہیں ہے۔ لہذا قانون شفعہ کی وہ دفعہ جس میں مزارع کو حق شفعہ دیا گیا وہ شریعت سے متعارض ہے اور اسے منسوخ کرنے کا حکم دیا۔

مستقبل میں اس طرح کی صورت حال سے بچنے کے لیے عدالت ہائے عالیہ میں شریعت بنچوں کی بجائے ایک مشترکہ عدالت کے قیام کی تجویز سامنے آئی۔

دوسری رکاوٹ یہ سامنے آئی کہ ہائی کورٹوں کے جج صاحبان جو ان بنچوں میں کام کررہے تھے وہ دیگر ہزاروں مقدمات کی سماعت بھی کرتے تھے۔ اس طرح اندیشہ تھا کہ اگر دیگر مقدمات کی طرح شریعت پٹیشن بھی پندرہ بیس سال تک لٹکتی رہی تو عوام کا نفاذ شریعت کے عمل سے اعتماد ختم ہو جائے گا۔ لہذا طے کیا گیا کہ چار شریعت بنچوں کے بجائے ایک مشترکہ شریعت کورٹ قائم کردی جائے۔

چنانچہ ۲۶ مئی ۱۹۸۰ء کو وفاقی شرعی عدالت قائم کردی گئی جس کا صدر دفتر اسلام آباد میں تھا۔ سپریم کورٹ کے ایک سابق جج وفاقی شرعی عدالت کے سربراہ بنے۔ چاروں ہائی کورٹوں میں سے ایک ایک جج لیا گیا۔ اس پانچ رکنی وفاقی شرعی عدالت نے کام شروع کردیا۔ لیکن فروری ۱۹۸۱ء میں اس عدالت نے سزائے رجم کے بارہ میں ایک فیصلہ دیا جس پر بڑی تنقید کی گئی اور اس کو ایک غلط فیصلہ قرار دیا گیا۔ پاکستان میں ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو سنت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو شریعت کا ماٴخذ تسلیم نہیں کرتا بلکہ صرف قرآن مجید کو شریعت اسلامی کا ماٴخذ ماننے کا دعوی کرتا ہے۔ اس طبقہ کے بعض حضرات نے وفاقی شرعی عدالت میں درخواست دی کہ پاکستان میں زنا سے متعلق قانون میں بدکاری کی سزا یعنی رجم قرآن سے متعارض ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے اور جن احادیث میں رجم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے وہ ساری کی ساری غیر مستند ہیں۔ لہذا اس سزا کو شریعت کے خلاف قرار دیا جائے۔

اس وقت وفاقی شرعی عدالت میں جو جج حضرات برسرکار تھے ان میں سے بعض شریعت کا اس درجہ کا تحقیقی اور عمیق علم نہیں رکھتے تھے جو اس طرح کے فیصلوں کے لیے ضروری تھا۔ وہ ان حضرات کے دلائل سے متاثر ہوئے اور جمہور مسلمانوں کو سنے بغیر انہوں نے کثرت رائے سے، یعنی پانچ میں سے تین ججوں نے یہ فیصلہ کردیا کہ رجم کی سزا شریعت کے متعارض ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ اسلام کے ایک ایسے حکم کے خلاف تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے درمیان متفق علیہ رہا ہے۔ لہذا اس فیصلہ پر دنیائے اسلام کی طرف سے انتہائی شدید ردعمل ہوا۔ خود صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی بڑی سبکی ہوئی۔ اب انہوں نے ایک نئی دستوری ترمیم کی جس کی رو سے وفاقی شرعی عدالت کی توسیع کر کے تین علماء کرام کو اس کا جج مقرر کیا گیا۔ وہ تین علماء کرام جو سب سے پہلے وفاقی شرعی عدالت کے جج مقرر کیے گئے یہ ہیں: جناب پیر محمد کرم شاہ صاحب مرحوم، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور ملک غلام علی صاحب مرحوم۔ اس ترمیم کے ذریعہ وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ اپنے کسی فیصلے پر از خود یا کسی شہری کی درخواست پر نظر ثانی کرسکتی ہے۔ بعد میں وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات میں یہ بات بھی شامل کردی گئی کہ وہ بطور خود (SUO MOTO) یعنی بغیر کسی شہری کی عرضداشت کے کسی قانون کا جائزہ لے سکتی ہے کہ آیا وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔

بعد میں ۱۹۸۲ء میں سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ میں بھی توسیع کردی گئی۔ بنچ کے ممبران کی تعداد پانچ کردی گئی اور دو علماء کرام کو شریعت اپیلیٹ بنچ میں بھی بطور ایڈہاک رکن مقرر کیا گیا۔

۱۹۸۰ء میں اپنے قیام سے لے کر آج تک وفاقی شرعی عدالت نے سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا ہے اور ان میں سے بہت سے قوانین

کی جزوی ترامیم کا حکم دیا ہے۔ حکومت کو مجبوراً وہ ترامیم کرنا پڑیں۔ یوں پاکستان میں سینکڑوں قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے اسلام کے مطابق بنایا جاچکا ہے اور یہ اتنی بڑی کامیابی ہے جو پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک میں حاصل نہیں کی جاسکی۔ پاکستان میں اس کامیابی کا سہرا وفاقی شرعی عدالت کے سر ہے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگ بارہا یہ اعتراض کرتے رہے ہیں کہ وفاقی شرعی عدالت نے قوانین پر نظر ثانی کرنے یا انہیں بہتر بنانے کے نام پر پارلیمنٹ کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ جو لوگ یہ مطالبہ اور تجویز کرتے رہے ہیں کہ قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا کام پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا جائے ان کی بات تجربے سے غیر مؤثر اور بے نتیجہ ثابت ہوئی ہے۔ پاکستان کی کسی پارلیمنٹ نے آج تک رائج الوقت ساڑھے تین چار ہزار قوانین میں سے ایک قانون میں بھی از خود کوئی جزوی تبدیلی تک نہیں کی۔ جبکہ وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے قوانین کو اسلامیانے کا کام کامیابی سے جاری ہے۔ اور یہ کام اتنے لطیف اور غیر محسوس طریقہ سے ہوا ہے کہ اس نے کوئی سیاسی یا انتظامی مسئلہ پیدا نہیں کیا، اس کی وجہ سے کوئی سیاسی اختلاف رائے نہیں ہوا، کوئی فرقہ وارانہ فضا پیدا نہیں ہوئی۔ عدالت کے ذریعے اسلامیانے کا کام زیادہ آسان اور زیادہ علمی سطح پر ہو رہا ہے۔ یہ زیادہ غیر سیاسی اور زیادہ غیر فرقہ وارانہ انداز کا ہے۔ اس سلسلہ میں اسمبلیوں کے ذریعے کوئی پیش رفت آج تک پاکستان میں نہیں ہوئی اور اگر کوئی اکا دکا قوانین بنائے گئے تو وہ انتہائی کمزور اور غیر مؤثر قوانین تھے جن کے عملاً بہت کم نتائج سامنے آئے۔ مثلاً جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے زمانہ میں دو تین چھوٹے چھوٹے قوانین نافذ کیے گئے جن کی کوئی بڑی افادیت نہیں تھی، البتہ جزوی طور پر ان کے بعض مفید نتائج ضرور سامنے آئے۔ ان میں سے ایک قانون قرآن مجید کی صحیح طباعت کے بارے میں تھا کہ قرآن مجید کا غلط نسخہ طبع کرنا جرم ہوگا۔ اور بھی چھوٹے چھوٹے قوانین تھے لیکن ۱۹۷۹ء سے پہلے کوئی بڑی پیش رفت نہیں ہوئی۔

زکوٰۃ وعشر آرڈیننس

۲۰ جون ۱۹۸۰ء میں تجرباتی بنیاد پر ملک بھر میں زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس نافذ کر دیا گیا جس میں زکوٰۃ کی وصولیابی کو رضاکارانہ قرار دیا گیا۔ اس آرڈیننس کے ذریعہ ایک سال کے لیے زکوٰۃ کی جمع آوری اور تقسیم کا ابتدائی تجربہ کیا جانا پیش نظر تھا، پھر اس تجربے کی روشنی میں ایک مستقل نظام اختیار کیا جانا تھا۔ ایک سال بعد جون ۱۹۸۱ء میں لازمی زکوٰۃ کی وصولیابی شروع ہوگئی۔ اس وقت سے زکوٰۃ اور عشر کی وصولی کا نظام جاری ہے۔ اگرچہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن یہ پاکستان کے موجودہ حالات کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک مفید کام تھا۔ جس کے مفید نتائج نکلے۔ نظام زکوٰۃ سے متعلق کئی اہم معاملات میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو نظر انداز کر دیا گیا اور کونسل کی سفارشات سے اتفاق نہیں کیا گیا۔ جو تجاویز قبول کی گئیں انہوں نے قانون کی روح کو بہت حد تک غیر مؤثر بنا دیا جس سے وہ نتائج سامنے نہیں آئے جو آنا چاہئیں تھے۔

زکوٰۃ وعشر کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر، مؤثر اور شفاف بنانے کی غرض سے ایک منفرد اور مستقل نظام قائم کیا گیا جس کے تحت پورے ملک میں کم وبیش چالیس ہزار مقامی زکوٰۃ کمیٹیاں، سو سے زائد ضلعی زکوٰۃ کمیٹیاں، کئی سو تحصیل زکوٰۃ کمیٹیاں اور چار صوبائی زکوٰۃ کونسلیں قائم کی گئیں۔ مرکزی سطح پر ایک زکوٰۃ کونسل قائم کی گئی جس کی سربراہی کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کے حاضر سروس جج کو نامزد کیا جاتا

ہے۔ اس پورے نظام کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کا نظام ملک کے عام سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ سے الگ تھلگ رہ کر خالص دینی اور انسانی بنیادوں پر کام کرے، اگر چہ اس مقصد کی کلی طور پر تکمیل نہیں ہو سکی تاہم ایک حد تک زکوٰۃ کی رقوم کو سیاسی افراتفری اور انتظامی بدعملی کے نتائج بد سے خاصی حد تک محفوظ رکھا گیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ گذشتہ بیس سال کے طویل عرصے میں اس نظام کی جو خوبیاں اور خامیاں سامنے آئی ہیں ان پر تفصیل سے غور وخوض کر کے اس نظام کو بہتر بنایا جائے۔

زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کے احکام میں فقہی اور دینی اعتبار سے بعض پہلو مزید غور وخوض اور نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ مثال کے طور پر فقہی بنیادوں پر بعض حضرات کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مکمل طور پر مستثنیٰ قرار دے دیا گیا جس سے بہت لوگوں نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ بعد میں بعض اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں نتیجے میں یہ استثنیٰ تقریباً عام ہو گیا۔ ان اسباب کی وجہ سے زکوٰۃ کی وصولی اس حد تک نہیں ہو رہی جس حد تک ہونی چاہیے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں جب بینکوں کی جملہ بچتیں ۶۲ ارب روپے کے لگ بھگ تھیں اس وقت زکوٰۃ کی وصولی ۶۴ کروڑ روپے کے قریب تھی۔ اب جبکہ بینکوں کی تمام بچتیں ۱۲ کھرب یعنی ۱۹ گنا بڑھ چکی ہیں زکوٰۃ کی وصولی صرف ساڑھے چار ارب تک بڑھی ہے۔ اس سے بھی کمزور حال عشر کی وصولی کا ہے جو کم ہوتے ہوتے اب صفر کے قریب پہنچ چکی ہے۔ ان حالات میں اس ضرورت کا احساس اور بڑھ جاتا ہے کہ زکوٰۃ کے پورے نظام پر از سرِ نو غور کر کے اس کو مزید بہتر بنایا جائے۔

رائے عامہ کی تیاری

پاکستانی معاشرے کو اسلامیانے کے حوالے سے رائے عامہ کی اہمیت اور اس کی تیاری کی ضرورت کا احساس کیا گیا۔ اس غرض کے لیے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی ہدایت پر اسلام آباد میں کئی کانفرسوں کا انعقاد کیا گیا۔

اگست ۱۹۸۰ء میں علماء کنونشن منعقد ہوا جس میں مختلف مکاتب فکر کے ایک سو کے قریب نامور علماء کو مدعو کیا گیا۔ شرکائے کنونشن نے ملک میں معاشرے کو اسلامیانے کے سلسلے میں حکومت کے اقدامات کا جائزہ لیا اور اس کام کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ صدر مملکت نے اس کنونشن میں بنفس نفیس شرکت فرمائی اور کنونشن کی سفارشات پر عمل درآمد کے لیے چھ کمیٹیوں کی تشکیل کا اعلان کیا۔ کنونشن نے اپنی سفارشات میں ملکی نظام تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے، موجودہ نظام قانون کو فی الفور ختم کرنے، اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹیں عوام کے لیے شائع کرنے اور ان پر عمل کرنے، ملکی معیشت سے سود کے عمل دخل کو جلد از جلد ختم کرنے، زکوٰۃ وعشر آرڈیننس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق تبدیلیاں کرنے اور قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے کام کو تیز کرنے جیسی تجاویز کا ذکر تھا۔ لیکن نہ ان کمیٹیوں نے کوئی قابل ذکر کام کیا اور نہ کنونشن کی سفارشات پر عمل درآمد کی رفتار حوصلہ افزا رہی۔

دسمبر ۱۹۸۲ء میں صدر مملکت نے نفاذ اسلام کانفرنس بلوائی جس میں ان تمام افراد اور اداروں کو مدعو کیا گیا جو کسی بھی حوالے سے اسلامائزیشن کے کام میں مصروف تھے۔ اس کانفرنس میں جو سفارشات مرتب کی گئیں ان میں یہ باتیں شامل تھیں کہ اسلامائزیشن کے طریق کار پر تفصیل سے غور کر کے ترجیحات کا تعین کیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کو عوام کے لیے شائع کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ جون ۱۹۸۳ء تک مروجہ قوانین بھی شریعت کے مطابق ڈھال دیئے جائیں، ماسوائے ان امور کے جن میں دوسرے ممالک کے ساتھ لین دین جاری

ہو۔ صدر مملکت نے اس اجتماع میں بھی خود شرکت فرمائی اور مختلف وزارتوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی وزارتوں سے متعلقہ امور کو نوٹ کریں اور پھر ان پر ضروری اقدامات کریں۔

جنوری ۱۹۸۴ء میں سرکاری سطح پر ایک اور علماء کنونشن کا انعقاد ہوا۔ یہ کنونشن بھی اسلام آباد میں منعقد ہوا اور اس کی صدارت بھی صدر مملکت نے کی۔ کنونشن میں صدر پاکستان نے اسلامائزیشن کے حوالے سے حکومت کو درپیش مشکلات کا ذکر کیا اور شرکائے کنونشن سے ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے تجاویز طلب کیں۔ اس کنونشن میں بھی علماء کی طرف سے تقریباً وہی سفارشات مرتب کی گئیں جو اس سے پہلے ایسی کانفرنسوں اور کنونشنوں میں تیار ہو کر حکومت کو پیش کی جاتی رہی تھیں۔ ان سفارشات پر عمل درآمد کے لیے صدر مملکت کی طرف سے ذاتی طور پر وعدے تو بہت ہوئے، لیکن سرکاری سطح پر ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی قابل ذکر اور نتیجہ خیز اقدام نہیں کیا گیا۔ البتہ ان اجتماعات کا ایک جزوی فائدہ ضرور ہوا، اور وہ یہ کہ ملک میں رائے عامہ کا خاصا مؤثر حصہ نفاذ اسلام کے عمل کے بارہ میں بیدار اور فعال رہا۔

انصاری کمشن

ملک کے نظام حکومت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے بھی سرکاری سطح پر مشاورتی اقدامات ہوئے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء کو مولانا ظفر احمد انصاری کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ کمیشن کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ ایسے اصول تجویز کرے جن کی بنیاد پر ملک کے لیے ایک مثالی اسلامی اور جمہوری سیاسی آئینی ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکے۔ اس کمیشن میں علماء، قانون دان، اعلیٰ عدالتوں کے ریٹائرڈ جج صاحبان اور اہل قلم شامل تھے۔ کمیشن نے ان مختلف کمیٹیوں کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات کا بھی جائزہ لیا جو ابتداء میں اس مقصد کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ کئی ہفتوں کے طویل غور و فکر اور مشاورت کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ صدر کو پیش کر دی۔ اس میں ۵۴ کے قریب سفارشات پیش کی گئیں۔ رپورٹ میں پاکستان میں کیے جانے والے آئینی تجربات کا تجزیہ شامل تھا، اور اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ماضی میں جو چند حل اختیار کیے گئے ان کی ناکامی کے اسباب کیا تھے، ملک کو درپیش سیاسی مسائل کے حل کے لیے رپورٹ میں کئی نئی تجاویز پیش کی گئیں اور چند نئے طریقے تجویز کیے۔ ان میں سے چند سفارشات صدر نے منظور کر لیں جن کو ۱۹۸۵ء کے آئین کی آٹھویں ترمیم میں شامل کر لیا گیا۔ ان میں ایک اہم بنیادی سفارش یہ بھی تھی کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا فعال اور مؤثر حصہ قرار دیا جائے۔

قراردادِ مقاصد آئین کا حصہ

مارچ ۱۹۸۵ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے قرارداد مقاصد کو ۱۹۷۳ء کے آئین کا باقاعدہ عملی حصہ (SUBSTANTIVE PART) بنا دیا گیا۔ قبل ازیں یہ ایک دیباچے کے طور پر آئین کا حصہ تھی۔ اس بناء پر قرارداد مقاصد میں شامل شقوں پر عمل درآمد کے لیے عدالتی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ۱۹۷۲ء۔ ۱۹۷۶ء کے سالوں میں متعدد اعلیٰ عدالتوں نے اپنے ملاحظات میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ چونکہ قرارداد آئین کا فعال حصہ نہیں بلکہ محض ایک دیباچہ اور اعلان مقاصد و ہداف ہے، اس لیے اس پر دستور کی فعال دفعات کی طرح عملدرآمد نہیں کیا جا سکتا۔ عدالتوں کے ان ملاحظات کے پیش نظر ہی کمیشن نے قراردادِ مقاصد کو دستور کا فعال حصہ بنانے کی سفارش کی تھی۔ اب آئین کی دیگر دفعات کی طرح قرارداد مقاصد کے باقاعدہ عملی حصہ بن جانے کے بعد قرارداد مقاصد کی کسی شق پر عمل نہ ہونے

کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاسکتا ہے۔ اگر چہ سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ نے قرارداد مقاصد کے اثرات کو محدود کر دیا ہے، پھر بھی دستور کے فعال حصہ کے طور پر اس کا وجود اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔

پرائیویٹ شریعت بل اور نواں ترمیمی بل

جولائی ۱۹۸۵ء میں سینٹ میں ایک پرائیویٹ شریعت بل پیش کیا گیا جس کا مقصد نفاذ اسلام کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرنا تھا۔ اس کے محرک سینیٹر قاضی عبداللطیف اور سینیٹر مولانا سمیع الحق تھے۔ یہ محض ایک پرائیویٹ تحریک کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس بل یا دستاویز میں بڑی نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا تھا جن کی تکمیل کے لیے دوررس آئینی ترامیم درکار تھیں، جبکہ بل اپنی موجودہ صورت میں آئینی ترامیم کے انداز میں نہیں تھا۔ یہ بل مختلف سٹینڈنگ کمیٹیوں کے زیر غور رہا۔ اگر یہ بل پاس بھی ہو جاتا تو اس کی افادیت عملاً بہت محدود ہوتی، کیونکہ کسی آئینی قرارداد پر عمل کروانے کے لیے جب تک اس کے تقاضوں کے مطابق آئین میں ترمیم نہ کی جائے وہ بے سود رہتی ہے۔ بہر حال اس بل نے قانونی حلقوں میں گرما گرم بحث پیدا کر دی اور پریس میں مختلف النوع مسائل پر مباحثات کا آغاز ہوا۔ افسوس کہ ان مباحثات سے کسی بالغ نظری کا اشارہ نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دستاویز کا مسودہ بہت عجلت میں اور غیر فنی انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ تاہم اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ اس نے ملک میں نفاذ اسلام کے موضوع پر عوامی اور اخباری گفتگو کو مہمیز دی اور اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے قانونی اور آئینی طریقوں پر اب تک جو غور و خوض ہوا تھا اس کے بارے میں لوگوں میں خاصی آگاہی پیدا کر دی۔ شریعت بل نے ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کو دو متحارب کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔ جہاں کچھ لوگ شدت سے اس کے حامی تھے وہیں بہت سے حضرات مختلف اسباب کی بناء پر اس کے شدید ناقد تھے۔

دسمبر ۱۹۸۵ء میں حکومت وقت نے ایک درمیانی راستہ نکالا اور سینٹ میں نواں دستوری ترمیمی ایکٹ پیش کر دیا، جو جولائی ۱۹۸۶ء میں سینٹ سے منظور ہو گیا۔ اس ترمیمی ایکٹ میں یہ کہا گیا کہ اسلام کے احکام جیسا کہ وہ قرآن وسنت سے ماخوذ ہوں' ملک کا بالاتر قانون اور رہنمائی کا مأخذ ہوں گے اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے وضع کردہ قوانین کے ذریعے نافذ ہوں گے۔ وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات میں محدود توسیع کی گئی۔ آئین اور مالیات کے قوانین بدستور اس کے دائرہ کار سے باہر رکھے گئے۔ البتہ وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ماہرین معاشیات کے تعاون سے سفاشات مرتب کر سکتی ہے اور سفارشات بھی ایسی جو سابقہ تاریخوں سے نافذ نہیں ہو سکیں گی۔

یہ نواں ترمیمی ایکٹ صرف سینٹ سے پاس ہوا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ قومی اسمبلی اس پر غور کرتی ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے وزیر اعظم محمد خان جونیجو مرحوم کی حکومت اور قومی اسمبلی کو توڑ دیا۔ صدر مملکت نے جونیجو حکومت کی ناکامی کے جو اسباب بیان کیے ان میں سے ایک سبب یہ بھی بتایا کہ وہ حکومت اسلامائزیشن کے لیے کام کرنے میں ناکام رہی تھی۔

نفاذِ شریعت آرڈیننس

۱۵ جون ۱۹۸۸ء کو صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے نفاذ شریعت آرڈیننس جاری کیا۔ اس آرڈیننس کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئر مین ڈاکٹر عبدالواحد جے ہالے پوتا کی سربراہی میں ایک خصوصی کمیٹی نے متفقہ طور پر تیار کیا تھا۔ اس آرڈیننس کے اہم نکات یہ تھے:

شریعت ملکی قانون کا بالاتر مأخذ ہے اور یہ ریاست میں پالیسی سازی کے لیے اولین ہدایت کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کسی عدالت میں یہ

سوال پیدا ہو کہ کوئی قانون شریعت کے مطابق ہے یا نہیں تو اسے وفاقی شرعی عدالت کے پاس بھیجا جائے گا۔ جو امور اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں ان کے لیے ہائی کورٹ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ ہائی کورٹوں کی رہنمائی کے لیے مفتی مقرر ہونگے۔علماء کا تقرر بطور جج ہو سکے گا۔ وہ وکیل کی حیثیت سے بھی کام کر سکیں گے۔ عدلیہ کے موجودہ ارکان کے لیے شریعت وفقہ کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے گا۔ ملک کے تعلیمی اور معاشی نظاموں کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے آرڈیننس کے اجراء کے ایک ماہ کے اندر اندر صدر دو مستقل کمیشن قائم کرے گا جو ایک سال کے اندر صدر کو رپورٹ پیش کریں گے اور متعلقہ شعبوں میں اسلامائزیشن کے پروگراموں کی نگرانی کریں گے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو آرڈیننس کی مدت ختم ہو جانے سے قبل ہی اسی وقت کے قائم مقام صدر جناب غلام اسحاق خان نے نفاذ شریعت ترمیمی آرڈیننس جاری کیا۔لیکن یہ ۱۴ فروری ۱۹۸۹ء کو زائد المیعاد ہو کر از خود ختم ہو گیا۔کیونکہ حکومت وقت نے اس آرڈیننس کی مدت میں نہ تو توسیع کی اور نہ یہ آرڈیننس منظوری کے لیے قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ حزب اختلاف اور اسلامی حلقوں نے اس پر آواز بھی اٹھائی اور حکومت پر یہ تنقید کی گئی کہ وہ شریعت آرڈیننس کے نفاذ میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

۱۹۹۰ء کی انتخابی مہم کے دوران شریعت کا نفاذ اہم انتخابی مسائل میں شامل ہو گیا۔اکتوبر ۱۹۹۰ء میں وزیر اعظم محمد نواز شریف کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہ توقع کی جا رہی تھی کہ اسمبلی ترجیحی بنیادوں پر شریعت بل پاس کر دے گی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۹۱ء میں ایک بل پاس تو ہوا لیکن اسے عمومی طور پر غیر مؤثر سمجھا گیا اور اسے ایک بادل ناخواستہ اٹھایا ہوا قدم تصور کیا گیا۔

قصاص و دیت کا قانون

حدود قوانین کے علاوہ ایک اور اہم قانون جس نے پاکستان میں فوجداری قانون کی حد تک نفاذ اسلام کے ہدف کی سمت میں ایک بڑی پیش رفت کو یقینی بنایا ہے وہ قصاص و دیت کا قانون ہے۔ قصاص و دیت کے شرعی احکام پر مشتمل باقاعدہ ایکٹ ۱۷ مارچ ۱۹۹۷ء کو نافذ ہوا۔

لیکن اس قانون کے باقاعدہ ایکٹ بننے کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں وفاقی شرعی عدالت کے جناب جسٹس آفتاب حسین مرحوم نے اپنے ایک فیصلہ میں تعزیرات پاکستان (PAKISTAN PENAL CODE) کی کچھ دفعات کو خلاف شریعت قرار دیا تھا،اس لیے کہ ان میں قتل کے مقدمات میں قصاص،دیت اور راضی نامہ کی گنجائش نہیں تھی۔زخم وغیرہ کے مقدمات میں بھی شریعت کے احکام کے مطابق تاوان دینے کی گنجائش نہیں تھی۔حکومت پاکستان نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت بنچ میں اپیل دائر کر دی۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنے واضح قانون کو جس کے بارہ میں ہر مسلمان جانتا تھا کہ وہ اسلام کے منافی ہے حکومت کو بدلنے میں کیا تامل تھا،اس قانون کو اسی حکومت کی قائم کردہ وفاقی شرعی عدالت نے شریعت سے متصادم قرار دیا تھا۔پھر حکومت پاکستان نے اس قانون کے حق میں اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کیوں دائر کی تھی؟ یہ اپیل دس سال تک سپریم کورٹ میں لٹکی رہی اور اس کی سماعت نہ ہو سکی۔اور نہ ہی اس کا فیصلہ ہو پایا۔ بالآخر جون ۱۹۹۰ء میں اس اپیل کی سماعت ہوئی اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ نے اس فیصلہ کو برقرار رکھا اور تعزیرات پاکستان کی ۵۵ دفعات کو شریعت سے متعارض قرار دے کر کالعدم کر دیا۔سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد مقررہ تاریخ سے تعزیرات

پاکستان کی وہ ۵۵ دفعات کالعدم ہوگئیں جن کے خلاف وفاقی شرعی عدالت نے ۱۹۸۰ء میں فیصلہ دیا تھا اور جس کو سپریم کورٹ نے برقرار رکھا تھا۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے بالآخر حکومت پاکستان نے اکتوبر ۱۹۹۰ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے سے ایک آرڈیننس جاری کیا جو قصاص و دیت آرڈیننس کہلاتا ہے۔

لیکن یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ ۱۹۹۷ء سے پہلے کسی اسمبلی نے اسے ایکٹ بنا کر قانون کا درجہ نہیں دیا۔ پوری اینگلوسیکسن تاریخ میں یہ شاید پہلا اور واحد موقع تھا کہ ایک آرڈیننس کو جو درجنوں مرتبہ جاری کیا جا چکا تھا اسے ملک کی پارلیمنٹ نے اتنی طویل مدت تک منظور نہ کیا۔ ہر آرڈیننس کی مدت چار ماہ ہوتی ہے، اس دوران اگر پارلیمنٹ اسے منظور نہ کرے تو منسوخ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قصاص و دیت کا یہ آرڈیننس بار بار نافذ ہوتا رہا۔ ہر چار ماہ بعد جب بھی یہ منسوخ ہونے کے قریب آتا تو صدر ایک بار پھر اس آرڈیننس کو جاری کر دیتا۔ ۱۹۸۵ء کی اسمبلی سے لے کر ہر اسمبلی میں جب بھی یہ قانون زیر بحث آیا ماہرین شریعت اور علمائے کرام کو اس قانون کے دفاع میں کچھ کہنے اور عرض کرنے کا موقع ملا ہے، لیکن ہر اسمبلی کے معزز ارکان نے اس قانون کے خلاف ایک ہی طرح کے اعتراضات کیے۔ ان اعتراضات کا ایک ہی طرح سے جواب دیا گیا۔ ان جوابات کا ایک ہی طرح سے جواب الجواب دیا گیا اور بالآخر اسمبلی برخواست ہو جاتی تھی اور نئے انتخابات کے بعد پھر اعتراضات کا وہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بالآخر QISAS AND DIYAT ACT 1997 کے ذریعے اسے باقاعدہ اور مستقل قانون کا درجہ ہو گیا۔

قومی معیشت کو سود پاک کرنے کی کوششیں

اسلامی نظام معیشت کو سود سے پاک کرنے کا عمل نفاذ اسلام کے ایجنڈے پر سرفہرست رہا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا تھا۔ کونسل اس وقت سے لے کر آج تک پاکستان کے نظام معیشت میں اسلامی اصلاحات متعارف کرانے اور اسے سود سے پاک کرنے کے لیے متعدد سفارشات پیش کر چکی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں کونسل نے ماہرین، معیشت دانوں اور بینکاروں کا ایک پینل مقرر کیا تھا۔ اس پینل کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ ملکی معیشت کو سود سے پاک کرنے اور اسلامی احکام کے مطابق ملک کے اقتصادی اور مالی نظام کی از سر نو تشکیل دینے میں مدد کرے۔ ان ماہرین نے ۱۹۸۰ء میں کونسل کو اپنی رپورٹ پیش کی جس پر کونسل نے غور و خوض کر کے چند ترامیم اور مناسب اضافوں کے بعد اسے حکومت کو بھجوا دیا۔ یہ رپورٹ ماہرین معاشیات، بینکاروں اور ملک کے نامور علماء کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی اور ملک کے تمام پڑھے لکھے لوگوں کے اتفاق رائے کی ترجمانی کرتی تھی۔ اس رپورٹ میں بینکوں اور مالیاتی اداروں کو سود سے پاک کرنے کے لیے ایک مفصل طریق کار تجویز کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ نے اسلامی دنیا کے علمی، معاشی اور اسلامی حلقوں میں بڑی دلچسپی پیدا کر دی۔ حکومت پاکستان نے اس رپورٹ کے مندرجات پر غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ قومی معیشت کو سود سے پاک کرنے کے لیے اس رپورٹ میں دی گئی سفارشات کو نافذ کر دیا جائے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے ملک میں بینکاری کے تمام اداروں کو حکم نامہ جاری کیا کہ وہ سود کی بنیاد پر تمام لین دین ختم کر دیں اور ۲۰ جون ۱۹۸۴ء کو جاری کیے گئے حکم نامے میں شامل مالی لین دین کے ۱۳ متبادل طریقوں کو اپنا لیں۔ یہ متبادل طریقے وہی تھے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رپورٹ میں تجویز کیے گئے تھے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اصولی اور نظری طور پر یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے قومی معیشت کو سود سے پاک کر دیا گیا تھا۔ یہ تاریخ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے اپنے حکم نامہ نمبر ۱۳ میں مقرر کی تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان وجوہ کی بناء پر جو صرف اسٹیٹ بینک کے مقتدر حضرات ہی کو معلوم ہوں گی، بینکوں نے اس حکم نامے پر عمل نہیں کیا۔ اسٹیٹ بینک جس کی حیثیت بینکوں کے نگراں اور سرپرست کی ہے، اس سے یہ توقع تھی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ اس کے حکم نامہ پر پورا پورا عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن شاید بینکوں کو اس امر کی پوری آزادی دے دی گئی کہ وہ اس حکم نامے کے متن کی تشریح جس طرح چاہیں کریں اور انہیں شاید یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ متبادل طریقوں کو اپنائیں یا نہ اپنائیں۔

فروری ۱۹۷۹ء میں اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ شریعت کے منافی قوانین کو کالعدم قرار دے دیں۔ اس وقت اس دائرہ اختیار سے مالیات سے متعلق قوانین کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ مستثنیٰ قرار دینے کی یہ رعایت ابتدا میں تین سال کے لیے تھی۔ اس تین سالہ مدت کے بارے میں بادی النظر میں تو یہ سمجھا گیا اور بات کہی بھی گئی کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ سود سے پاک نظام کی طرف منتقل ہونے کے عمل کو بتدریج مکمل کرنے کے لیے سہولت فراہم کر جائے۔ تین سال کے عرصہ میں بتدریج یہ کام مکمل کر لیا جائے۔ کونسل کی بلاسود بینکاری رپورٹ نے بھی تین سالہ پروگرام تجویز کیا تھا۔

اس پروگرام کے تین مراحل تھے۔ ہر مرحلہ ایک سال پر مشتمل تھا۔ یہ مراحل تجویز کرنے میں یہی حکمت تھی کہ اس عرصے میں مجوزہ تبدیلیاں بسہولت لائی جا سکیں۔ ۱۹۸۱ء میں اعلان کیا گیا کہ حکومت پاکستان نے اس رپورٹ کو منظور کر لیا ہے اور اس کے مطابق تین سال کے اندر مالیاتی قوانین میں سود کا عنصر ختم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جب تین سال کے استثناء کی بات کی گئی تو لوگوں نے اس کو ایک انتظامی مصلحت کے طور پر قبول کر لیا۔ لیکن اس تین سالہ مدت کے گذرنے کے بعد آئین میں مزید ترمیم کر کے یہ مدت پہلے تو چار سال کے لیے بڑھا دی گئی، بعد ازاں ایک اور ترمیم کے ذریعے یہ مدت پانچ سال تک کر دی گئی۔ جب پانچ سال پورے ہونے کو آئے تو مزید ایک ترمیم کر کے مدت کو سات سال کر دیا گیا۔ پھر جب صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے نفاذ اسلام کے عمل کو جاری رکھنے کے سوال پر ریفرنڈم کرایا اور اس کے نتیجہ میں اپنی مدت صدارت کو توسیع دی تو اس ریفرنڈم میں ان کو یہ مینڈیٹ بھی دیا گیا تھا کہ وہ نفاذ اسلام کی اس پالیسی کو جاری رکھیں گے۔ لیکن انہوں نے ریفرنڈم جیتنے کے بعد دستور میں مزید ترامیم کیں اور "نفاذ شریعت" کے گویا پہلے اقدام کے طور پر اس مدت کو سات سال سے بڑھا کر دس سال کر دیا گیا۔

یہ دس سالہ مدت ۲۶ جون ۱۹۹۰ء کو ختم ہو گئی۔ اور اسی تاریخ سے وفاقی شرعی عدالت کو مالیاتی قوانین کا جائزہ لینے کا اختیار مل گیا۔ کیونکہ اس تاریخ سے مالیاتی قوانین کا استثناء ختم ہو گیا تھا۔ ان دنوں یہ بات کثرت سے کہی جاتی تھی کہ حکومت دستور میں ترمیم کر کے یہ استثناء مزید بیس سال کے لیے بڑھانا چاہتی ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی کوشش یا خواہش تھی بھی تو اس خواہش پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ شاید اس لیے کہ دستور میں ترمیم کے لیے حکومت کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں دو تہائی ارکان کی اکثریت حاصل نہیں تھی۔

۲۶ جون ۱۹۹۰ء کو جب وفاقی شرعی عدالت کو مالیاتی قوانین پر اختیار حاصل ہوا تو اس سے اگلے چند روز میں وفاقی شرعی عدالت میں ۱۱۳ درخواستیں دائر کر دی گئیں، جن میں پاکستان کے ۲۴ قوانین کو زیادہ تر سودی احکام کی بناء پر چیلنج کیا گیا تھا۔ وفاقی شرعی عدالت نے ان

درخواستوں کی ایک سال تک سماعت کی اور ۱۶ نومبر ۱۹۹۱ء کو ایک متفقہ فیصلہ سنایا۔ بعض قوانین کو کلیتہً منسوخ کرنے کا حکم دیا اور بقیہ میں جزوی ترامیم کی ہدایت کی کیونکہ یہ قوانین کلی یا جزوی طور پر شریعت کے منافی تھے اور سود کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ ۲۰ مئی ۱۹۹۲ء سے مؤثر ہونا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حکومت چند ماہ قبل اپریل ۱۹۹۱ء میں شریعت ایکٹ کے نام سے ایک قانون بھی پارلیمنٹ سے منظور کروا چکی تھی۔ لہٰذا بجا طور پر توقع کی گئی کہ حکومت اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ میں اپیل دائر نہیں کرے گی، لیکن اپیل دائر کر دی گئی۔ ۱۹۹۲ء میں دائر کی گئی یہ اپیل ۱۹۹۸ء تک زیر التواء ہی رہی۔ بالآخر سات سال کے طویل وقفہ کے بعد ۱۹۹۸ء کے آخر میں اس اپیل کی سماعت شروع ہوئی جو کم و بیش سات آٹھ ماہ جاری رہی۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو عدالت عظمیٰ کے شریعت اپیلٹ بنچ نے اس اپیل کا فیصلہ سنایا۔ جس کی رو سے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کو برقرار رکھا گیا، سود پر مبنی بینکاری نظام کو خلاف شریعت قرار دیا گیا اور حکومت کو مزید ڈیڑھ سال کی مہلت دی گئی تاکہ وہ ملکی معیشت کو غیر سودی بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے اقدامات کر سکے۔

یہ مہلت ختم ہونے سے قبل یونائیٹڈ بینک کی طرف سے اس فیصلے کو معطل کرنے اور اس پر نظر ثانی کرنے کی درخواست دائر کر دی گئی۔ حکومت پاکستان نے اس درخواست کی جزوی حمایت کی اور مزید مہلت کی درخواست کی۔ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ نے سود کو حرام قرار دیے جانے سے متعلق فیصلے کو معطل کرنے کی یونائیٹڈ بینک کی درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ فیصلہ معطل کرنے اور ۳۰ جون ۲۰۰۱ء کی مدت میں توسیع دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکومت پاکستان نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۵ء تک کی مہلت مانگی تھی، لیکن شریعت اپیلٹ بنچ نے ۱۴ جون ۲۰۰۱ء کو یونائیٹڈ بینک کی نظر ثانی کی درخواست پر فیصلہ سناتے ہوئے حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۲ء تک مزید ایک سال کی مہلت دے دی۔ بینک کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ حکومت کی نیت صاف ہے۔ انہوں نے مختلف کمیٹیوں کی رپورٹیں پیش کیں اور بتایا کہ ۲۰ قوانین میں سے ۸ کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ شریعت اپیلٹ بنچ نے حکومت کو ۳۰ جون ۲۰۰۲ء کی مہلت دیتے ہوئے حکم دیا کہ اس اضافی مدت میں عدالت عظمیٰ کے فیصلے کے مطابق حکومت کو سود سے پاک معاشی نظام نافذ کرنے کے مؤثر اقدامات کرنا ہوں گے اور اس دوران عدالت عظمیٰ حکومت کے اس معاملے میں کیے گئے اقدامات کا جائزہ لیتی رہے گی۔ عدالت نے یہ واضح کیا کہ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ اس معاملے کو ایک بار پھر کھٹائی میں ڈال دیا جائے گا تو اسے یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

۲۴ جون ۲۰۰۲ء کو سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ نے یونائیٹڈ بنک کی نظر ثانی کی درخواست پر فیصلہ دیتے ہوئے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۹۱ء اور شریعت اپیلٹ بنچ کے فیصلہ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو متفقہ طور پر بعض نکات پر دوبارہ غور کے لیے وفاقی شرعی عدالت کے پاس بھجوا دیا۔ سپریم کورٹ نے فریقین کو اجازت دی کہ وہ وفاقی شرعی عدالت کے روبرو ان تمام نکات کو دوبارہ اٹھائیں جو انہوں نے فاضل عدالت میں اٹھائے ہیں اور جو متعلقہ نکات تشنہ رہ گئے وہ بھی زیر بحث لائے جا سکتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ سود کے حوالے سے وفاقی شرعی عدالت نے بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے، تمام ایشوز پر واضح فیصلہ نہیں دیا، حتیٰ کہ غیر مسلموں کے لیے بھی سود کی ممانعت کر دی گئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر اسلامی ممالک کے مالیاتی نظاموں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ بینکنگ سسٹم میں سود کا عمل دخل، اسے مطلق حرام قرار دیے جانے اور متبادل اسلامی بنکاری اور معاشی نظام کے قابل عمل ہونے کے بارے میں معاملات پر مزید غور اور تحقیق کی جائے۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں حکومت کے

موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ بینکنگ سسٹم اور سرمایہ کاری کے موجودہ نظام میں قرض پر سود کا کوئی پہلو نہیں نکلتا اور کسی پر اس نظام میں جبراً شریک ہونے کی پابندی بھی عائد نہیں ہوتی۔ لوگ رضاکارانہ طور پر سرمایہ کاری کی اسکیموں میں اپنی رقوم جمع کراتے ہیں اور منافع حاصل کرتے ہیں۔ وہ اپنی رقوم کو محفوظ تصور کرتے ہیں۔ فیصلے میں حکومت کے اس استدلال کا بھی ذکر کیا گیا کہ اگر فاضل عدالت کا فیصلہ من وعن نافذ کر دیا گیا تو ملک مالیاتی افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔

اسلامیانے کے عمل میں رکاوٹیں

پاکستانی معاشرے کو اسلامیانے کے عمل میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عوام میں جوش و جذبہ کی کمی

پاکستان میں فی الحال ایسا ماحول نظر نہیں آتا جو دینی احکام پر عمل درآمد کے لیے سازگار ہو۔ دینی احکام و قوانین کا نفاذ اور ان پر عمل ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ذمہ داری کے اس عمل کے لیے ہمت اور جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عوام میں وہ جذبہ اور حوصلہ پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ جذبہ اور حوصلہ پیدا کرنا صرف حکومتوں کا کام نہیں ہے، بلکہ ہم سب کا ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفاد پر زد پڑنے کے وقت شریعت سے پہلو تہی نہیں کرتے؟ ایسے لوگ کتنے ہیں جو سال ختم ہونے پر بینکوں سے رقم نہ نکلوائیں تاکہ ان کا مال زکوٰۃ کی ادائیگی کے نتیجے میں پاک ہو جائے؟ کتنے لوگ ہیں جو بینکوں سے اس لیے قرض نہیں لیتے کیونکہ اس پر سود ادا کرنا پڑتا ہے؟ کتنے لوگ ہیں جنہیں اگر کہا جائے کہ اس دوا میں آپ کی بیماری کا علاج تو ہے لیکن اس میں شراب یا کوئی اور حرام مواد پایا جاتا ہے اس لیے آپ اسے استعمال نہ کریں تو وہ اس سے رک جائیں؟ معاشرے میں اسلام کے عملی نفاذ کی اصل طلب اور جوش و جذبہ عوام کی طرف سے ہونا چاہیے جب تک وہ نہیں چاہیں گے اور اس بارے میں گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کریں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ میں صحیح پیش رفت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ ماہرین شریعت کی کمی

نفاذ شریعت کے کام کے لیے جس طرح کے ماہرین درکار ہیں وہ بہت کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔ نفاذ اسلام کے لیے مختلف شعبوں میں جس طرح کے ماہرین درکار ہیں اس طرح کے ماہرین تیار کرنے کا پاکستان میں کوئی جامع انتظام نہیں ہے۔ اگر آج ایسی حکومت برسر اقتدار آ جائے جو سو فیصد اسلام نافذ کرنا چاہے اور وہ پاکستان میں ایسے دس افراد تلاش کرنا چاہے جو صحیح اسلامی احکام کے مطابق دس قومی بینکوں کا نظام درست طریقہ پر چلا سکیں تو شاید پاکستان میں ایسے دس آدمی موجود نہ ہوں۔ بہت زیادہ دینی جذبہ رکھنے والے تو مل جائیں گے لیکن بینکاری کے حوالے سے بینکوں کے جدید نظام اور شریعت کے احکام میں ماہر افراد شاید انگلیوں پر بھی نہ گنے جا سکیں۔ ایسے کتنے وکلاء ہیں جو دنیا میں قانون سازی اور قانون دانی میں ماہر مانے جاتے ہوں اور شریعت میں ان کی مہارت بھی مسلّم ہو اور ان کی زندگی اسلامی تعلیمات سے عبارت بھی ہو۔ یہی حال ہمارے معاشرے میں دیگر شعبوں کا ہے۔

یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر جتنی جلد توجہ دی جائے اتنا ہی ضروری ہے۔ جب تک ایسی ٹیم تیار نہیں ہوگی اور مطلوبہ افراد میسر نہیں ہوں گے، یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اسلامیانے کا آغاز خواہ چھوٹی سطح پر ہو لیکن اس کے لیے مطلوبہ لوگ ملنے چاہئیں۔ چھوٹے پیمانے پر اسلامی بینکاری، قانون

سازی اور اسلامی عدالتوں کے قیام کے لیے جوں جوں کام شروع ہو، افراد بھی تیار ہوتے جائیں گے، ادارے بھی بنتے جائیں گے اور کام بھی ہوتا چلا جائے گا۔

۳۔ سیاسی سطح پر قوت فیصلہ کی کمی اور عدم دلچسپی

پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کے عمل میں ایک بڑی رکاوٹ حکومتی سطح پر قوت فیصلہ کی کمی ہے، اسلامی قوانین کے نفاذ کا کام جب کیا جائے گا تو اس سے بہت سے لوگوں کے مفادات پر زد پڑے گی۔ کئی بڑے بڑے برج گریں گے۔ اس کام میں سیاسی مفادات اور دباؤ کی پروانہ کرتے ہوئے حکومت کو جرأت مندانہ اقدام اٹھانا پڑیں گے۔ ضرورت پڑنے پر قوت اور طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا کہ حکومت ایک پہریدار ہے اور اسلام ایک بنیاد ہے۔ جس عمارت کا پہریدار نہ ہو اسے لوٹ لیا جاتا ہے اور جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے۔ لہٰذا اسلام کی عمارت قائم رکھنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد اور ایک طاقت ور دیانتدار چوکیدار کی ضرورت ہے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ ایک طبقے نے دباؤ ڈالا تو حکومت نے کوئی چھوٹا سا اسلامی قانون نافذ کر دیا۔ لیکن جو کچھ ایک ہاتھ سے دیا وہ فوراً ہی دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

۴۔ ملک کے بااثر طبقات

اسلام کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہمارے ملک میں بااثر طبقات ہیں۔ جو اپنے طبقاتی مفادات کا ہر صورت میں تحفظ چاہتے اور کرتے ہیں۔ پاکستان کے ایک سابق وزیر خزانہ نے (۱۹۸۵ء کے لگ بھگ) کہا تھا کہ پاکستان میں اسی ارب روپے کا ٹیکس حاصل ہونا چاہیے لیکن صرف بیس ارب روپے سرکاری خزانے میں جاتے ہیں۔ چالیس ارب روپے افسران کی جیب میں چلے جاتے ہیں اور بیس ارب روپے کا ٹیکس چوری ہوتا ہے۔ اگر چالیس ارب روپے افسران کی جیب میں جانے کا اندازہ صحیح ہے، تو جہاں پچاس فیصد سے زیادہ ٹیکس کی رقم ٹیکس جمع کرنے والوں کی جیب میں جاتی ہو تو کیا وہ لوگ ٹیکس کا نیا نظام آنے دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اس میں رکاوٹ پیدا کریں گے۔ جب زکوٰۃ کا نظام لایا گیا تو اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ کہا تھا کہ زکوٰۃ کے نظام کو کامیاب بنانے کے لیے ٹیکسوں کے نظام میں بڑی اور انقلابی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے، ورنہ زکوٰۃ کا نظام کامیاب نہیں ہوگا۔ اس وقت حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی ٹیکسوں کے پورے نظام پر نظر ثانی کی جائے گی۔ لیکن وہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں اور ٹیکسوں کا نظام اسی طرح رائج ہے۔ اس لیے کہ ایک بہت بڑے طبقے کا مفاد اس نظام سے وابستہ ہے۔ وہ طبقہ اس میں کوئی تبدیلی اور اصلاح نہیں ہونے دے گا۔ بینکنگ اور ٹیکسوں کے نظام میں درجنوں بار اصلاحات تجویز ہوئیں لیکن وہ نافذ نہیں ہونے دی گئیں کیونکہ اس سے کئی بااثر طبقات کے مفادات پر زد پڑتی تھی۔

۵۔ غیر ملکی دباؤ

شریعت کے نفاذ میں پیش قدمی کی جب بھی کوئی بات ہوتی ہے تو پاکستان پر غیر ملکی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ غیر ملکی اثرات اور ان کا دباؤ اتنا شدید ہوتا ہے کہ ہماری بڑی بڑی حکومتیں اس دباؤ کے تحت آ جاتی ہیں اور اسلامیانے کے عمل سے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ حکومت پاکستان پر غیر ملکی دباؤ اور اثرات کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے زمانے میں جب

پاکستان کی پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا اس وقت اسمبلی میں یہ بھی طے کیا گیا کہ شناختی کارڈ میں یہ لکھا جائے گا کہ کارڈ ہولڈر مسلمان ہے یا غیر مسلم، اور اگر غیر مسلم ہے تو عیسائی ہے، ہندو ہے یا قادیانی ہے۔ اسمبلی کے اس فیصلے پر ۱۹۹۲ء تک عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ جب ۱۹۹۲ء میں نئے شناختی کارڈ بننے لگے اور پرانے کارڈ منسوخ کیے جانے لگے تو حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسمبلی کے اس فیصلے پر عملدرآمد کیا جائے اور شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ رکھا جائے۔ لیکن بہت سی غیر ملکی طاقتوں اور تنظیموں نے اس کی مخالفت کی اور ان کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا کہ شناختی کارڈوں میں مذہب کا خانہ نہ رکھا جائے۔ حکومت نے اس غیر ملکی دباؤ پر اس فیصلہ کو واپس لے لیا۔

پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں غیر ملکی دباؤ کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں توہین رسالت کا قانون (BLASPHEMY LAW) نیا نہیں ہے۔ یہ قانون آج سے بہت پہلے بن چکا تھا۔ انگریزوں کے دور میں ۱۹۲۷ء میں THE CRIMINAL LAW AMENDMENT ACT XXV کے تحت انڈین پنل کوڈ ۱۸۶۰ء میں ایک نئی دفعہ ۲۹۵۔اے کا اضافہ کیا گیا تھا جس میں مذہبی عقائد کی توہین قابل تعزیر جرم قرار دی گئی تھی۔ بعد میں اس طرح کی دفعات کا اضافہ کیا جاتا رہا۔ ۱۹۸۰ء کے عشرہ میں چند اور ترامیم کی گئیں جن کی رو سے امہات المومنینؓ، اہل بیتؓ، خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کی بے حرمتی کو فوجداری جرم بنادیا گیا۔ اسی سلسلہ میں ایک نئی دفعہ ۲۹۵۔سی کا اضافہ کیا گیا جس کے تحت پیغمبر اسلام صلی علیہ والہ وسلم کی توہین کے مجرم کے لیے موت یا عمر قید کی سزا مقرر کی گئی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں وفاقی شرعی عدالت کے ایک حکم اور سینٹ کی ایک متفقہ قرارداد کی رو سے ۳۰ اپریل ۱۹۹۱ء سے توہین رسالت کے مرتکب کی سزا صرف موت مقرر ہوگئی۔

لیکن اس قانون پر دباؤ کتنا ہے؟ اس کا اندازہ ہر اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کو مغربی سفارخانوں سے مفت ویزے ملتے ہیں اور وہ جیل سے براہ راست ائیرپورٹ اور وہاں سے مختلف مغربی ممالک پہنچا دیے جاتے ہیں اور ان کے خلاف مقدمہ درج کرنے والے مدعی کے پیچھے بین الاقوامی ادارے اس طرح ہاتھ دھو کر لگ جاتے ہیں جیسے وہ خود ہی کوئی مجرم ہو۔

۶۔ مذہبی سیاست

پاکستان میں مذہبی طبقات کی آویزش اور مذہبی سیاست کا موجودہ انداز بھی نفاذ اسلام کے راستہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمارے ملک میں لوگوں نے جب سے مذہب کو سیاست کی بنیاد بنایا ہے اس وقت سے یہاں مذہبی فرقوں کی بنیاد پر سیاسی پارٹیاں وجود میں آگئی ہیں۔ جیسے جیسے یہ سیاسی پارٹیاں انتخابی میدان میں سرگرم ہوتی جاتی ہیں ملک میں فرقہ وارانہ تنازعات کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فرقہ وارانہ تنازعات کی شدت میں اسلام کے عمومی مقاصد پس پشت چلے جاتے ہیں اور جزوی اور فروعی تنازعات اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ مزید برآں جب مذہب کی بنیاد پر لوگ انتخابی دنگل میں اترتے ہیں تو اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام ایک اختلافی (CONTENTIOUS) مسئلہ بن جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض اہل علم اس رائے سے اختلاف کریں لیکن گذشتہ چالیس پچاس سال کا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ جب تک پاکستان میں مذہبی اور فرقہ وارانہ اپیل کی بنیاد پر ووٹ لینے والی سیاسی پارٹیاں موجود ہیں اور مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ سیاست ہو رہی ہے اس وقت تک

پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے راستے میں کوئی بڑی اور مثبت پیش قدمی نہیں ہوسکتی۔

خلاصہ کلام

ان رکاوٹوں پر اچھی طرح غور وخوض کر کے جب تک ان کا مؤثر سدباب نہ کیا جائے گا اس وقت تک نفاذِ اسلام کے باب میں فعّال اور تیز رفتار پیش رفت بہت مشکل ہوگی۔ ملک کی دینی جماعتوں اور مذہبی طبقات میں اس طرح ہم آہنگی پیدا ہونی چاہیے کہ وہ ملک وملت کے متفق علیہ اور مشترکہ اہداف کے بارہ میں یکساں نقطہ نظر رکھتے ہوں۔ ملک کی سیاسی زندگی کا اس انداز میں مثبت رخ دینے کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں علماء اور دینی طبقات کا اختلاف رائے فکری تنوع اور علمی سرمایہ میں اضافے کا سبب بنے، ملک وملت میں مزید کسی تفریق کا ذریعہ نہ بنے۔ علماء کرام اور اہل فکر و دانش کا بنیادی کردار اسلامی معاشرے میں ایک معلّم اور محتسب کا ہونا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری دینی جماعتیں اور مذہبی طبقات معاشرہ میں معلّم، مزکّی اور محتسب کا کردار انجام دیں۔ ایسا محتسب جو اپنے علمی وقار، روحانی مقام اور اخلاقی بلندی کے بل بوتے پر امت اور معاشرہ دونوں کو راہ راست پر رکھ سکے۔

اہم نکات

۱۔ پاکستان اس عہد وپیمان کے ساتھ وجود میں آیا تھا کہ یہاں اسلامی نظریات کو عملی شکل دی جائے گی۔

۲۔ قائداعظمؒ نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ قرار دیا تھا۔

۳۔ اسلامی قوانین کا نفاذ اس ہمہ گیر اور بھرپور تبدیلی کا ایک اہم حصہ ہے جسے ہم اقامت دین، نفاذِ شریعت یا نظام اسلام کا قیام کہتے ہیں۔

۴۔ اسلامی ریاست وحکومت سے متعلق معاملات تین اقسام کے ہوتے ہیں:

۱۔ وہ جو قرآن وسنت میں درج بنیادی احکام سے متعلق ہیں۔ یہ اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرہ کا اساسی عنصر ہیں جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور جو لازمی طور پر واجب العمل ہیں۔

۲۔ وہ جو فقہائے کرام کے اجتہادات کا نتیجہ ہیں۔ ان میں روحِ شریعت اور موجودہ حالات کے تحت تبدیلی یا نئے احکام وضع کیے جاسکتے ہیں۔

۳۔ وہ جو مسلمان حکمرانوں، ریاستوں اور اداروں نے تدبیر اور انتظام کے اعتبار سے اپنے حالات کے پیش نظر مرتب کیے۔ اگر یہ احکام موجودہ حالات کے سیاق وسباق اور اپنی معنویت میں قابل عمل ہیں تو انہیں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر ان سے بہتر کوئی تدابیر اور تنظیم موجود ہے تو اس کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ قراردادِ مقاصد ایک ایسی جامع اور متفقہ دستاویز ہے جس کا مسلمانوں بلکہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اہتمام کیا گیا۔ یہ آئین پاکستان

کا باقاعدہ عملی حصہ ہے۔

۶۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ مختلف دینی مکتب ہائے فکر کے علمائے دین اور فقہاء نے ایک اہم فقہی اور قانونی مسئلہ پر اتفاق رائے سے ایک جامع اور قابل عمل دستاویز تیار کی جو "علماء کرام کا بائیس نکاتی فارمولا" کہلاتی ہے۔

۷۔ علمائے کرام اور اسلامی نظریاتی کونسل کی تجویز پر پاکستانی عدلیہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ کسی قانون کو خلاف شریعت قرار دے کر منسوخ کردے ۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عدلیہ کو ایسا اختیار دیا گیا۔

۸۔ وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے سینکڑوں قوانین کو اسلام کے مطابق بنایا جاچکا ہے جبکہ پاکستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ پارلیمنٹ نے نفاذ شریعت کے حوالے سے آج تک کسی قانون میں ازخود کوئی تبدیلی نہیں کی۔

۹۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے متعدد قوانین پر نظرثانی کرکے اپنی سفارشات حکومتوں کو پیش کیں لیکن کونسل کی اکثر سفارشات پر حکومتوں نے سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور نہ رپورٹوں کو شائع کیا۔

۱۰۔ مسلم عائلی قوانین کو جدت پسندوں اور روایت پسند علماء کی بالترتیب انتہائی تائید اور تنقید حاصل رہی ہے۔

۱۱۔ قومی معیشت کو سود سے پاک کرنے میں مسلسل تاخیری حربے استعمال کیے جارہے ہیں، لیکن اسلامی ریاست میں اس معاملے کو کھٹائی میں نہیں ڈالا جاسکتا۔

۱۲۔ پاکستانی معاشرے میں حدود قوانین کے ثمرات اور مثبت اثرات ظاہر نہ ہونے کی وجہ ملک کا پروسیجرل لاء یعنی قانون ضابطہ اور تفتیشی اداروں کا فساد اور کرپشن ہے۔

۱۳۔ پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے اور نفاذ شریعت کے عمل میں موجود رکاوٹوں بنیں عوامی جوش وجذبہ کی کمی، ماہرین شریعت کی کمی، سیاسی سطح پر قوت فیصلہ کی کمی وعدم دلچسپی، ملک کے بااثر طبقات، غیر ملکی دباؤ اور پاکستان کی مذہبی سیاست وغیرہ کا مؤثر سدّ باب ضروری ہے

کتب برائے مزید مطالعہ

۱۔ عصرِ حاضر اور اسلام کا نظام قانون از ڈاکٹر محمد امین
ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ، اردو بازار لاہور